

ماہنامہ

مارچ 2024ء

# طہ و عالم

اشاعت کا اکیاسی وال سال



لَا نَبِيَّ بَعْدِنِي (الحدیث)  
حضرت محمد ﷺ کے بعد نبوت کا ہر دعویٰ باطل ہے

علامہ اقبال کے ایماء اور قائد اعظم  
کی خواہش پر 1938ء سے شائع  
ہونے وال امانت نامہ



بِسْمِ اللّٰهِ الرَّحْمٰنِ الرَّحِيْمِ

## پروزِ صاحبِ حکیمی اسلوب تحقیق کی تائید

قرآنی نظریات کی روشنی میں مغرب کے غلط تصورات کی تردید میں محترم پرویز اور ہمارے ہاں کے مفکرین نے بہت کچھ لکھا ہے۔ ان میں سے ڈاکٹر علامہ اقبال، ڈاکٹر رفع الدین احمد اور ڈاکٹر بہان احمد فاروقی کی تصنیفات سے چند اقتباسات پیش کئے جا رہے ہیں۔ جب بھی قارئین ان اقتباسات کی روشنی میں محترم پرویز صاحب کی تصنیفات کا جائزہ لیں گے تو وہ ان تمام خوبیوں کو بشمول دیگر خوبیوں کے ان میں پائیں گے۔ اس موضوع پر محترم پرویز صاحب کا موقف جاننے کے لئے خصوصی طور پر ان کی تاصانیف ”انسان نے کیا سوچا“ اور ”اسلام کیا ہے“ ملاحظہ فرمائی جاسکتی ہیں۔

### (1) ڈاکٹر علامہ اقبال کا موقف:

- عقل اور وجہ میں تصادم نہیں بلکہ دونوں لازم و ملزم ہیں۔
  - قرآن سے راہنمائی حاصل کرنے کے لئے ضروری ہے کہ:
- (الف) اپنے زمانوں کے تقاضوں اور اپنے دور کی فکری کاوشوں سے متعارف ہوں۔
- (ب) قرآن کریم کو عربی زبان اور تصریف آیات کی رو سے سمجھنا چاہئے اور اس پر خارجی عناصر کو اثر انداز نہیں ہونے دینا چاہئے۔

### (2) ڈاکٹر محمد رفع الدین کا موقف:

- مغرب کے غلط فلسفیانہ تصورات کی تردید قرآنی نظریات سے کرتے ہوئے مصنف کے لئے ضروری ہے کہ:
- وہ روح قرآن کے ساتھ پوری پوری واقعیت پیدا کریں جس کے بغیر قرآنی اور غیر قرآنی تصورات میں تمیز کرنا مشکل ہو گا۔
  - وہ مغرب کے غلط تصورات کے اصل ماذد اور ان کے مقبیعین کے طرز خیال عمل سے پوری پوری واقعیت پیدا کریں۔
  - وہ علم کے تمام شعبوں سے یعنی مادی، حیاتیاتی اور نفسیاتی علوم اور فلسفہ سے جوان علوم کو جمع کر کے ایک مکمل نظریہ کائنات ترتیب دیتا ہے اس حد تک واقف ہوں کہ ان کی ساری وسعت میں جہاں کہیں کوئی اسلامی تصور موجود ہوا سے پچان کر لے سکیں اور استخراج اور استنباط سے مزید صحیح اسلامی تصورات کو اخذ کر سکیں۔

3 شمارہ نمبر | جلد 77

ماہنامہ طلوعِ اسلام  
لاہور مارچ 2024ء

## اس شمارے میں

صفحہ نمبر	مصنف	عنوان
4	ادارہ	لمعات
6	پرویز	کہاں میں کہاں یہ مقامِ اللہ اللہ!
24	پرویز علیہ الرحمۃ	درس قرآن (سورۃ البقرۃ آیات 228 تا 233)
47	غلام احمد پرویز	روزوں کا مقصود و منشی
54	ادارہ	محشرستان فلسطین (گذشتہ سے پیوستہ)
61	ادارہ	علامہ پرویز کی آخری اپیل
62	ادارہ	سپاسنامہ بخدمت قائد اعظم محمد علی جناح

چیئر میں: خورشید انور

مجلس ادارت

ڈاکٹر انعام الحسن، ڈاکٹر ابی عباس رسول  
اقبال اور لیں ایڈوکیٹ

مدیر انتظامی: محمد سعید اختر

قانونی مشیر: ملک محمد سعید ایڈوکیٹ

ادارہ کا مضمون یا گاری تحریر سے ٹھیک اتفاق ضروری نہیں۔

زیر تعاون: 50 روپے فی پرچہ  
پاکستان: 600 روپے سالانہ  
رجسٹرڈ ڈاک: 1000 روپے سالانہ

ادارہ طلوعِ اسلام-B-25 گلبرگ، لاہور 54660، (پاکستان)  
Cell: +92 310-4800818

 idarati@gmail.com  www.facebook.com/Talueislam

### Bank Account Idara Tolu-e-Islam

<p>National Bank of Pakistan, Main Market Branch Gulberg Lahore For Domestic Transactions Bank A/C No: 0465004073177672</p>	<p>For International Transactions IBAN: PK36NBPA0465004073177672 Swift Code: NBPAPKKAA02L</p>
---	---

ادارہ طلوعِ اسلام (رجسٹرڈ) کی مطبوعات سے حاصل شدہ جملہ آمدن قرآنی فکر عالم کرنے پر صرف کی جاتی ہے

# طلوعِ عالم

غلامی میں نہ کام آتی ہیں شمشیریں نہ تدیریں  
 جو ہو ذوقِ یقین پیدا تو کٹ جاتی ہیں زنجیریں  
 کوئی اندازہ کر سکتا ہے اُس کے زورِ بازو کا!  
 نگاہِ مردِ مومن سے بدل جاتی ہیں تقدیریں  
 ولایت، پادشاہی، علم اشیا کی جہاں گیری  
 یہ سب کیا ہیں، فقط اک عکٹہ ایماں کی تفسیریں  
 براہیمی نظر پیدا مگر مشکل سے ہوتی ہے  
 ہوس چھپ چھپ کے سینوں میں بنالیتی ہے تصویریں  
 تمیزِ بندہ و آقا فسادِ آدمیت ہے  
 حذر اے چیرہ دستاں! سخت ہیں فطرت کی تغیریں  
 حقیقت ایک ہے ہر شے کی، خاکی ہو کہ نوری ہو  
 لہو خورشید کا ٹپکے اگر ذرے کا دل چریں  
 یقینِ محکم، عملِ یہم، محبتِ فاتحِ عالم  
 جہادِ زندگانی میں ہیں یہ مردوں کی شمشیریں  
 چہ باید مرد راطبع بلندے، مشرب ناہے  
 دل گرمے، نگاہِ پاک بینے، جان بیتابے

(بانگ درا۔ علامہ اقبال)

(جاری ہے)

# معاٹ

جمهور کے اپلیس ہیں ارباب سیاست  
اب میری ضرورت نہیں باقی تھے افلک ①

یورپ نے ”جمهوری تماشا“ کا جشن بنا کر قومِ عام کو عجیب قسم کا انخوکہ بنارکھا ہے۔ جمہوریت کے متعلق فریب یہ دیا جاتا ہے کہ اس میں اقتدار اور اختیارِ عوام کے ہاتھ میں ہوتا ہے حالانکہ یہ اختیارِ اس وقت تک ہوتا ہے جب تک ”ووٹ کی پرچی“، اس شخص کے ہاتھ میں ہوتی ہے۔ جوہی اس نے وہ پرچی ”ڈبے“ میں ڈالی، اس کے اختیار و اقتدار کی حدود ختم ہو گئیں۔ اس کے بعد تمام اختیار و اقتدار بظاہر اس شخص کے ہاتھ میں چلا جاتا ہے جو ان پر چیزوں کی رو سے منتخب ہو جاتا ہے۔ یہ منتخب ہونے والا دوسرے لیکن تک اسی قسم کا آمر ہوتا ہے جیسے دنیا کے اور ڈکٹیٹر۔ البتہ اسے راگ یہ الپاپڑتا ہے کہ اختیارِ اس کے ہاتھ میں نہیں عوام کے ہاتھ میں ہے۔ حقیقت یہ ہے کہ اس نام نہاد جمہوریت میں سیاست کا اصل مقصود حصول اقتدار ہوتا ہے یا گروہی مفادات کا تحفظ۔ پیشہ ور سیاستدان ایوان حکومت میں درآتے ہیں، نکال دیئے جاتے ہیں۔ حکومتیں بدلتی ہیں، حکمران بدلتے ہیں۔ ہر حکمران نئے دعوؤں اور جدید نعروں کے ساتھ نہودار ہوتا ہے۔ مند حکومت پر ہیں تو سب کچھ کر گزرنما روا۔ اور ایوان حکومت سے نکالے گئے یا وہاں تک نہیں پہنچ پائے تو حکومت کے خوب کو ناخوب کہنا اور اس کے محاسن کو معائب کا نام دینا فرض قرار پا جاتا ہے۔

جہاں تک جمہوریت کے عملی تجربہ کا تعلق ہے، پچھلے 77 برس سے ہم اسی کی بھینٹ چڑھے ہوئے ہیں۔ ملکی معاملات میں نت نئے تجربات، معاشرے کی چیزیں پکار، قوم کی زبوب حالی، قدم قدم پر زندگی کی ہڈیاں چھینگ کی درد اگیز آہیں، ارباب بست وکشاد کے اپنے اعلانات کہ ہمارے ہاں رشوٹ، بد دینا تی، نالائقی، اقربا پروری، انفرادی مفاد پرستی کی لعنت دن بدن بڑھ رہی ہے۔ ہم حکمرانوں کے ایک گروہ سے تنگ آ کر انتخاب کا مطالبہ کرتے ہیں لیکن نئے انتخابات کے بعد انہی جیسا ایک اور گروہ ہم پر مسلط ہو جاتا ہے۔ ہمارے وہ رہنمایوں ایوان حکومت تک نہیں پہنچ پاتے پھر عوام کے پاس پہنچ جاتے ہیں کہ ٹرین ہم نے چلا دی ہے۔ تھوڑا سادھا کا اور لگادیں اور یوں سمجھ لیں کہ اقتدار آپ کے قدموں میں ہے۔ عوام کا تعاون انہیں بھی میسر تھا، عوام

① ”اپلیس کی عرض داشت“۔ بالِ جریل۔ علامہ اقبال

ان کے بھی ساتھ ہیں لیکن ”سیاسی جدوجہد“ نہ اس وقت کسی نظام کے حق میں تھی نہ آج کسی نظام کے خلاف ہے۔ تب بھی شخصیات کے خلاف تھی اب بھی شخصیات ہی کے خلاف۔ نظریوں آتا ہے کہ ملک کی بساط سیاست پر چند شاہراہیں ہیں جو جوڑ توڑ اور ہار جیت میں لگے رہتے ہیں۔ یہ ہمارے موجودہ نظام سیاست میں اساسی خرابیوں کے علاوہ ان ہی ارباب ہوس کی ریشہ دوایوں کا بھی نتیجہ ہے۔ حیرت ہے کہ چیز اسی کی ایک معمولی سی آسامی کے لئے تو معیار مقرر ہے لیکن ہماری پاریمان یا سینٹ کے ارکین کے لئے کوئی بنیادی معیار مقرر نہیں۔ نتیجہ ظاہر ہے۔ کاش ہم لوگوں نے قرآن سمجھ کر پڑھا ہوتا۔

طلویع اسلام اس موضوع پر بہت کچھ لکھ چکا ہے۔ جس کی تفصیل میں جانا ممکن نہیں تاہم حالاتِ حاضرہ کے پیش نظر یہ مشورہ ہم سیاسی راہنماؤں کو ضرور دینا چاہیں گے کہ:

روپے اور پرائیگلڈ کے زور پر ہنگامہ آرائیاں برپا کر کے دوسروں کو مرعوب تو کیا جاسکتا ہے لیکن ایسی روشن اور اس قسم کی ذہنیت کے حصہ میں بقایہ نہیں ہوتی۔ خدا کا اصل قانون ہے کہ بیہاں بقا اسی کو نصیب ہو سکتی ہے، جو اس پر وکر ام کو لے کر اٹھے جو اقدار سماوی (قرآنِ کریم کے بنیادی آئین) کے مطابق عام انسانیت کے لئے منفعت بخش ہو، آمماً مَا يَنْفَعُ النَّاسَ فَيَمْكُثُ فِي الْأَرْضِ (17:13) اس لئے یہاں بھی آخر الامر بقاء اسی کی ہوگی جو سیاسی فرقہ واریت سے بلند ہو کر قرآن کے نظامِ ربویت کو لیکر اٹھے گا۔ جھکڑا اور آندھیاں درختوں کو جڑ سے اکھیر سکتی ہیں مگر لہلہتی کھیتیاں پیدا نہیں کر سکتیں۔ جو جماعت اس راز کو پالے گی وہی نوع انسانی کی نفع بخشنیوں کا ذریعہ بنے گی اور ثبات و بقا اسی کے حصہ میں آئے گی۔

سیاسی جماعتیں جب ملکی اور قومی مفادِ عامہ کی بجائے اپنے مطالبات کو سامنے رکھیں گی تو حکومتیں کیسے مصلحتوں کا شکار نہیں ہوں گی۔ موجودہ حالات میں بہتر تو یہی تھا کہ ما پسی کی غلطیوں سے سبق سیکھا جاتا اور سیاسی فرقہ بندی جھوڑ کر ایک وسیع البنیاد متفقہ اور متحده حکومت تشکیل پاتی جس کا ملک نظر صرف اور صرف ”ما ینفع الناس“، ہوتا ایک دوسرا کی ٹانگ کھینچنے کی بجائے سب کندھے سے کندھاما کر کھڑے ہوتے۔ ملک کو اس بحران سے نکلنے کی کوشش کی جاتی۔ اب بھی وقت ہے کہ ڈھلوان کے سفر کو روکنے کی کوشش کی جائے۔ یہ عہدوں پر لڑنے جھکڑے نے کا وقت نہیں ہے بلکہ سیاسی فرقہ بازی چھوڑ کر، جسے قرآن نے شرک سے تعبیر کیا ہے، ملکی اور قومی مفادات کی خاطر ہر طرح کی قربانی دینے کا جذبہ پیدا ہونا چاہئے۔ یہ ہمارے ارباب سیاست کا امتحان ہے۔

### سانحہ ارتھاں

محترم بشیر عبدالثریٰ، طلویع اسلام ٹرست گذشتہ ماہ وفات پا گئے۔ مرحوم کی فکرِ قرآنی کی توسعہ و تعارف کے سلسلہ میں خدمات ناقابل فراموش ہیں۔ دعا ہے کہ اللہ تعالیٰ مرحوم کو اعلیٰ علیین میں جگہ دے۔ ادارہ لواحقین و اعزہ اقرباء کے غم میں برابر کا شریک ہے۔

ادب گاہیست زیر آسمان از عرش نازک تر نفس گم کرده می آید جنید و بازیید ام جا

# کہاں میں کہاں مقام، اللہ اللہ!

جب سے میرے شعور نے آنکھ کھولی، ایک نہایت حسین و تابناک آرزو کو دل کی گہرائیوں میں پھلتے، انگڑائیاں لیتے

دنیا کیا جانے کہ اس پیکرِ محبو بیت ﷺ کے ساتھ ہمارا کیا رشتہ ہے۔ ایک زندگی کیا، ہزار بار زندگی نصیب ہوا اور ہزار بار اس شاہنشاہ کو نینیں ﷺ کی ناموس پر پچھاوار ہو جائے تو بھی دل کی تمنا برندہ آئے۔ جس سینے میں عشق رسول ﷺ کا سوز نہیں، سینہ نہیں۔ بد بختیوں اور تاریکیوں کا قبرستان ہے۔ جس دل میں ناموں محمد ﷺ پر مر منٹے کی تمنا نہیں، دل نہیں، بوم و کرس کا دھشت انگیز نہیں ہے۔

(ماہنامہ طلوعِ اسلام، دسمبر 1941ء، صفحہ 51-52)

موسویٰ کی طرح شوق دید تیز تر ہوتا جاتا تھا، لیکن اس کی تسلیم کا کوئی سامان مہیا نہیں ہوتا تھا۔ چند سال اُدھر سے میری عمر رسیدگی اور مسلسل صحت کی خرابی کی بنا پر، اس کی امید بھی افسردہ ہوتی چلی جاتی تھی۔ حتیٰ کہ سال گذشتہ کے ناقابل برداشت حادث نے اس چراغِ نہ دامان کو قریب قریب گل کر دیا تھا اور جی رہا تھا تو صرف اس قرآنی مشن کے سہارے جسے میں نے اپنی زندگی کا مقصد بنارکھا ہے۔ میرے قربی احباب اس صورتِ حالات سے بڑے مشوش تھے۔ لیکن، ہوغم ہی جانگداز تو غم خوار کیا کرے!

گذشتہ مارچ، اسی تشویش سے متاثر ہو کر، میرے قریب ترین قرآنی عزیز، عمر دراز خان کویت سے لاہور آئے۔ میں

نے اپنے متعلق انہیں ہزار مطمئن کرنے کی کوشش کی لیکن ان جھوٹی تسلیوں سے ان کا جی نہ بہلا۔ انہوں نے احباب سے مشورہ کیا تو انہوں نے کہا کہ ان کے نزدیک اس کا علاج یہ ہے کہ مجھے کسی نہ کسی طرح موجودہ ماحول سے نکال لیا جائے جس کی فضا بڑی غم آلوہ ہے۔ انہوں نے کہا کہ ہم نے کافی کوشش کی ہے کہ انہیں کسی صحت افزامقام پر لے جایا جائے۔ لیکن یہ اس پر آمادہ نہیں ہوتے۔ عمر دراز خان نے کہا کہ انہیں اس فضائے نکالنے کے لئے بڑی زبردست کوشش کی ضرورت ہے اور میں اس کوشش کو اپنے ساتھ لے کر آیا ہوں۔ مجھے یقین واثق ہے کہ میں اس میں کامیاب ہو جاؤں گا۔

اور انہوں نے ایک دن، بلا کسی تمہید کے مجھ سے کہا کہ میں چاہتا ہوں کہ آپ کو مدینہ منورہ لے چلوں۔ اس کے لئے سب انتظام مکمل ہے۔ آپ تاریخ کا تعین کر دیجئے۔

میں نے یہ سننا تو میری آنکھوں کے سامنے کوندا سالپک گیا۔ میرے عروق مردہ میں برقِ تپاں کی لہر دوڑ گئی۔ میرے قلبِ حزیں میں یوں سمجھنے کو یاً میدوں کے دروازے کھل گئے۔ مجھے حیاتِ تازہ کا پیام مل گیا۔ حیرت اور نمرت کے جذبات اس قدر تلاطم خیز تھے کہ میں ایک لفظ بھی زبان سے نہ نکال سکا۔ انہوں نے آنکھوں ہی آنکھوں میں سب کچھ سمجھ لیا اور کہا کہ پروگرام یہ ہے کہ یہاں سے پہلے کویت چلیں۔ وہاں سے قرآنی احباب کا ایک قافلہ ہم رکاب ہو گا۔ خشکی کے راستے، مختلف مقاماتِ مقدسہ سے نورِ بصیرت حاصل کرتے آگے بڑھتے جائیں گے۔ راستے میں دہران، ریاض، طائف وغیرہ کے قرآنی احباب بھی چشم براہ ہیں۔ اس کے بعد اس کے بعد اس کے بعد ان کی آوازِ رندھگی۔ میری آنکھوں میں بھی آنسو آگئے۔

برادرِ گرامی میاں ظفر محمود (مشیر قانون فوجی فاؤنڈیشن) اتفاق سے پاس ہی بیٹھے تھے۔ کہنے لگے کہ انہیں سفر کا کوئی مرحلہ بھی تنہیں کرنے دینا چاہئے۔ میں قدم اول سے آخر تک ساتھ رہوں گا۔ اور یوں میری زندگی کی شاخِ خزاں دیدہ کو نوید بھاریں گئی۔

---

اس کے بعد ”سرخ فیتے“ کی پابندیاں راستے میں حائل ہونا شروع ہو گئیں جن کی وجہ سے پروگرام میں کئی تبدیلیاں کرنی پڑیں۔ کویت کا ویزا تو آسانی مل گیا لیکن سعودی عرب میں صرف عمرہ (یعنی جدہ، مکہ مدینہ) کا ویزا مل سکا۔ اندر وہ ملک جانے کا نہ مل سکا۔ میں نے بہر حال اسی کو غنیمت سمجھا۔ 13 اپریل کی صبح، قدم اول کے طور پر جانبِ کراچی روانہ ہوا، اس احساس کے ساتھ شاداں و فرحاں کہ۔

بایں پیری رہ یثرب گرفتم	نو انوار از سرورِ عاشقانہ
چوں آل مرغے کہ در صحراء سر شام	کشايد پر بقیر آشیانہ

## رو بہ کراچی:

کراچی جہاز کی رسیدگی اور جدہ کے لئے دوسرے جہاز کی روائی کے درمیان تھوڑا سا وقہ تھا۔ میں نے کراچی کے احباب سے کہہ رکھا تھا کہ میری اس آمد کا چرچانہ کریں۔ میں واپسی پر وہاں ٹھہروں گا تو سب سے ملوں گا۔ لیکن اس کے باوجود کچھ قرآنی احباب، خلوص و محبت کے گراس قدر تھا ف لئے ہوٹل مڈوے میں جمع ہو گئے اور قرآنی مذاکرات کی ابتداء و ہیں سے ہو گئی۔ عمر دراز خان پہلے کویت جا چکے تھے۔ میں اور محترم ظفر محمود صاحب شام کے جہاز سے جانب جدہ روانہ ہوئے۔

میں نے فیصلہ کیا ہے کہ اس رو انداز میں، نہ تو اپنے تاثرات شامل کروں گا اور نہ ہی کسی قسم کی تنقید و تبصرہ سے اس حکایت شیریں میں، تلخی پیدا ہونے دوں گا۔ اس کے لئے وہ کئی موقع آئیں گے۔ میں سر دست اپنے آپ کو کوائنف نویں تک محدود رکھوں گا۔ کہوں گا تو صرف اتنا کہ میرے رفقاء جس طرح صوباتِ سفر کے ہجکاروں کو اپنے آپ پر رکھتے رہے اور ان کی جنبش تک بھی مجھ تک نہ پہنچنے دی۔ یہ سفر اسی سے مکن ہوسکا۔ فالحمد لله علیٰ ذلک۔

## جد ۵:

وہاں کے وقت کے قریب آٹھ بجے شب، جدہ ائیر پورٹ پر پہنچے تو کویت کے قرآنی احباب۔ عزیزم عمر دراز خان، ان کی بیگم صاحبہ اور دونوں بیویوں کو (جو میرے لئے بمنزلہ اپنی بیویوں کے ہیں)۔ نیز محترم ماسٹر محمد طفیل اور شفیق صاحب اور دہران بزم کے میر محمد آٹھنی اور عزیزم خالد حمید کو سامنے منتظر پایا۔ سفر کی تمام کوافت مبدل بر راحت ہو گئی۔

قرآنی رشتہ بھی کیسا عجیب رشتہ ہوتا ہے! رات جدہ میں بسر کی 14 اپریل کی صبح قریب دس بجے، جس کعبہ کی طرف رخ کر کے تمام عمر نمازیں پڑھتے رہے، اس کی سمت عملًا گامزن ہوئے اس وقت سینہ میں جذباتِ شوق کا جو تلاطم برپا تھا، اخفاکی ہزار کوششوں کے باوجود آنکھوں میں امنڈا نے والے آنسو، اس کی غمازی کر رہے تھے۔

عمر بھر، مکہ اور اس کے مضافات کو قرآن کے الفاظ میں، وادیٰ غیر ذی زرع (بے برگ و گیاہ وادی) لکھتا رہا لیکن اس کا مفہوم آج سمجھ میں آیا جب اس وادی کو اپنی آنکھوں سے دیکھا۔ ”خشک پہاڑ“ تپتے ہوئے صحراً، ویران دشت، بُجُر ز میں، بے آباد میدان وغیرہ الفاظ اکثر بولے جاتے ہیں، لیکن جو بھی انک منظر یہاں دکھائی دیا یہ الفاظ اس کا تصور تک پیش نہیں کر سکتے۔ سیاہ بھینگ پہاڑ جن کے متعلق اندازہ ہوتا ہے کہ کسی زمانے میں آتش فشاں تھے۔ ان کے پتھر، پتھر نہیں بلکہ وہ ہیں جنہیں ہمارے ہاں ”کھنگر“ کہا جاتا ہے اور قرآن نے جنہیں بیحِ جارَةٍ مِّن سَجْنِیل<sup>۳</sup>(105:4) کہا ہے۔ سبزہ تو ایک طرف، کہیں روئیدگی تک کا نشان نہیں۔ ان سے نیچے اتریئے تو ایسا ریگستان جس سے (اس نسبتاً معتدل موسم میں بھی) لو کے شعلے اُبھرتے تھے۔ کہیں پانی کا قطرہ تک نہیں۔ زندگی کا سراغ تک نہیں۔ یہ تھاجدہ سے مکہ تک کارستہ جسے ہم طے کر رہے تھے۔ یہ تو حرم پاک کی متصاضی کیش ہے جو این وآل سے بے گانہ کشان کشان جانب منزل لئے جاتی ہے، ورنہ وحشت و

دہشت کے اس مسلسل منظر سے انسان کا دل بیٹھ جاتا ہے۔

ایک بجے کے قریب ہم بیت اللہ کے بابِ عالیٰ کے سامنے تھے۔ لیکن قبل اس کے ہم بحضور کعبہ حاضر ہوں، جی چاہتا ہے کہ میں ان خیالات کو قلم بند کر دوں جو عظمتوں اور رفتگوں کی اس آماجگاہ کے ماحول کے متعلق میرے دل میں ابھرے تھے۔ حرم پاک، ساری دنیا میں منفرد مقام ہے۔ اس کی انفرادیت اہمیت اور شرف و جد کا تقاضا ہے کہ جو نبی ہم جوار مکہ میں داخل ہوں، ہماری عقیدتوں کا یہ مرکز ابھر کر ہمارے سامنے آ کر باعث فروغ دیدہ اور وجہ تسلیم قلب ہو اور جوں جوں ہم اس کی طرف بڑھتے جائیں، شادابیاں اور نکھت پاشیاں فرش را نہیں جائیں۔ یعنی اس کی (Approacah) ایسی ہو کہ اس پر ہزار بھاریں ثار ہوں۔ لیکن مضافتِ کعبہ اس کے بالکل برعکس ہے۔ کعبہ کے فطری محل و قوع کے متعلق یوں سمجھئے گویا ایک بہت بڑا پیالہ ہے جس کے پیندے میں حباب آسا ایک عمارت ہے۔ مکہ کے چاروں طرف پہاڑیاں ہیں اور ان کے اندر نشیب میں خانہ کعبہ ہے۔ اس کے اس محل و قوع کا بدل دینا تو ممکن نہ تھا لیکن اس کے بعد انسانی ہاتھوں نے جو کچھ کیا ہے اسے تو روکا جاسکتا تھا۔

حریم کعبہ بے شک ایک عظیم عمارت ہے لیکن اس کی دیواروں کے ساتھ ساتھ شاہراہیں ہیں جن پر ہر وقت ٹریفک کا سیالا ب روائی دوال رہتا ہے۔ ان شاہراہوں سے ملتی ہے، ہر طرف سر بغلک عمارتیں ہیں اور یہ مسلسلہ پورے حدود تک پھیلا ہوا ہے جس کا نتیجہ یہ ہے کہ حرم کعبہ ان عمارت کی بلندیوں تلنے دب کرہ گیا ہے۔ بس یوں سمجھئے گویا (لاہور کے) اندر وون شہر محلہ کی کوئی مسجد ہو کہ جب تک آپ اس کے دروازے میں داخل نہ ہوں، اس کے عدم وجود کا پتہ نہ چلے۔ ایسا ہی ماحول مسجد نبوی ﷺ کا ہے! دل انہیں بلند و بالاد کیھنا چاہتا تھا۔

### طوافِ کعبہ:

اب ہمت کر کے آگے بڑھتے۔ ہم نے احرام جدہ سے باندھ لیا تھا۔ سب سے پہلے عمرہ کے مناسک ادا کرنے ضروری تھے اور ان میں سرفہرست طوافِ کعبہ تھا۔ وسیع و عریض صحنِ کعبہ مسقف نہیں، اس لئے اس وقت وہاں تپش کافی تھی۔ لیکن طائفین کا جذب و کیف اس سے کب متاثر ہوتا ہے۔ وہ انتہائی محیت کے عالم میں، سرفروشانہ انداز سے، مصروف طواف تھے۔ ہمارے کاروائی کی جوئے کم آب بھی اس بحر بے کنار میں جذب ہو گئی۔ اس بے خودی کے عالم میں میرے لب پر قرآنی دعا نہیں تھیں۔ میں سبقت کرتا تھا اور میرے ہم نواحیاں اسی ذوق و شوق سے دھراۓ جاتے تھے۔ دل سوز سے لبریز۔ لب پر یہ پر کیف صدائیں۔ آنکھیں زمزمه بار۔

دھوپ تیز ہوتی جا رہی تھی اور مجھے ڈر تھا کہ میرے مضحل اعصاب شاید اس تپش کو برداشت نہ کر سکیں۔ لیکن حسن اتفاق کے عین اس وقت صحنِ حرم پر بادل سایہ فگن ہو گئے اور ہاکا ساترخ بھی ہوا جس سے موسم خاصاً معتدل ہو گیا۔ میرا سر نیاز بے ساختہ بدرگاہِ ربِ ذلیمن جھک گیا۔

استئنے میں کبوتر ان بام حرم کا ایک جھرمٹ صحنِ کعبہ میں اُتر آیا جسے دیکھ کر اقبالؐ کی وہ عالیٰ پر آگئی جوانہوں نے امیرِ مسلمہ کے ضعف و ناتوانی کو سامنے رکھ کر مانگی تھی کہ

بجز ایں دعا کہ بخششی بہ کبوتر اس عقابی  
کعبہ کے دروازہ کے سامنے آیا تو یوں سمجھتے کہ جھوپی پھیلا کر مبداء جود و سخا کی بارگاہ میں عرض کیا کہ  
خواجہ من، نگاہ دار آبروئے گدائے خویش آنکہ کہ ز جوئے دیگراں، پرنہ کند پیالہ را

خاتمة خدا کا دروازہ خالص سونے سے منڈھا ہوا ہے جس کے نیچے، سونے ہی کے جلی حروف میں جلالت الملک (شاہ)  
خالد ابن سعید کھا ہے (بعد کے الفاظ اس وقت ذہن میں مستحضر نہیں)۔

گراں بہا سنگ مرمر کے اس نبار اور زیر خالص کے اس سیلاں میں، گداگروں کے پھیلائے ہوئے ہاتھ، عجیب تضاد  
پیدا کر رہے تھے۔ لیکن میں نے تو خاموش رہنے کا عہد کر رکھا ہے۔ اس لئے

اگر یک سرمومئے برتر پرم فروع تجلی بسو زد پرم

### سمی:

سمی بین الصفا والمرودہ کا مرحلہ خاصاً مشقت طلب نظر آیا۔ اگرچہ وہاں اب نہ وہ پہاڑیاں ہیں اور نہ ہی وہ ریگ زار۔  
اسے مسقّف بھی کر دیا گیا ہے اور خنک بھی۔ لیکن زیادہ چلنے سے میرے پاؤں میں جوغزش پیدا ہو جاتی ہے اس سے اس سمی  
کی ہمت اپنے اندر نہیں پاتا تھا۔ لیکن مجھ سے مریضوں کے لئے وہاں پہنچنے دار کرسیوں کا انتظام کر دیا گیا ہے۔ جو اس سال  
وجہاں بخت عزیزم خالدؑ کی قوت بازو نے یہ مرحلہ آسان کر دیا۔

ظہر کی نماز مسجد الحرام میں ادا کرنے کے بعد اپنی قیام گاہ پرواپس آگئے۔ یہ ہوٹل، حریم کعبہ کے سامنے تھا لیکن وہ بلند و  
بال اعمارات جن کا میں نے پہلے ذکر کیا ہے، مستقل جگاب بن کر حائل تھیں۔ مغرب اور عشاء کی نمازیں بھی وہیں جا کر پڑھیں۔  
بھلی کی روشنی کے سیلاں میں اس کی جگہ گاہٹ کا عالم ہی کچھ اور تھا۔ لیکن میری نگاہیں کچھ اور دیکھنے کو ترس رہی تھیں۔ کسی نے  
شاید میرے قلبِ مضطرب کی ترجمانی کرتے ہوئے کہا تھا کہ وہ آپکے ہیں، مگر انتظار باقی ہے۔

### 15 پر میں:

صحیح دس بجے کے قریب میدانِ عرفات دیکھنے کے لئے گئے۔ حج اسی مقام پر ہوتا ہے۔ ایک لق و دق، بے برگ و گیا  
میدان جس کے ایک جانب ایک چھوٹی سی پہاڑی پر (جسے جبلِ رحمت کہتے ہیں)۔ ایک (سفید) سانشان ہے جس کے متعلق کہا  
جاتا ہے کہ حضور ﷺ نے حجۃ الوداع کا خطبہ وہاں سے نشر فرمایا تھا۔ وہ خطبہ جلیلہ جنوں ع انسان کی آزادی کا عالم گیر منشور ہے۔

## میدانِ عرفات:

حضور کے عہدِ ہمایوں میں، عرفات کے میدان میں زیادہ سے زیادہ ایک لاکھ کا اجتماع ہوا تھا۔ لیکن نگہ نبوی ﷺ کس قدر دُور رستھی کہ اس کے لیے ایسے میدان کا انتخاب کیا گیا کہ آج بیس لاکھ کا حجم غیر بھی اس کے ایک گوشے میں ساجائے۔ نظامِ خداوندی کی یہی وہ نشراً گاہ ہے جہاں سے ایک دن پھر اس انقلابِ عظیم کی آواز بلند ہونی ہے جس نے نوع انسان کو ہر قسم کی غلامی سے نجات دلانی ہے۔ کس قدر بلند و بالا ہے مرتبہ اس چھوٹی سی پہاڑی کا!

پروگرام طائفِ جانے کا بھی تھا۔ لیکن ایک ناشدنی حادثہ کی وجہ سے وہاں نہ جاسکے۔

## 16 اپریل:

شام کو منی گئے اور وہاں جو کچھ دیکھا اسے بیان کرنے کے لئے بس اتنا ہی کہہ سکتا ہوں کہ \_\_\_\_\_ ہوش میں آلوں تو کہوں! یہ وہ مقام ہے جہاں قربانی کے جانور ذبح کئے جاتے ہیں۔ پہلے ان لاکھوں جانوروں کو ذبح کرنے کے بعد گڑھوں میں دبادیا جاتا تھا۔ لیکن رفتہ رفتہ ان کی تعداد اس قدر بڑھ گئی کہ زمین ان کی تحمل نہ ہو سکی۔

## منی کی بھٹیاں:

اب وہاں مہیب بھٹیاں نصب ہیں۔ ان ذبح شدہ جانوروں کو ان بھٹیوں میں ڈال کر راکھ کا ڈھیر بنادیا جاتا ہے۔ میں ان بھٹیوں کو دیکھ رہا تھا اور نوائے سروش یہ سرگوشی کر رہی تھی کہ

صورتِ آئینہ سب کچھ دیکھ منہ سے کچھ نہ کہ!

آگے بڑھتے تو ان تین ”شیطانوں“ سے ملاقات ہوئی جو لاکھوں حاجیوں کے کروڑوں سنگ ریزوں کا ہر سال ہدف بنتے ہیں لیکن ان کا کچھ نہیں بگرتا۔ پہلے یہ کھل آسان کے نیچے ایستادہ تھے لیکن اب پتھراو کرنے والوں کے ہجوم کی وجہ سے اس ابلیس کا ہو دمنزلہ بنادیا گیا ہے اور اسی ضرورت کے تحت ان (شیاطین) کو زیادہ قدر آور کر دیا گیا ہے، حالانکہ (اقبال) کے قول کے مطابق (شیطان نے مدت ہوئی یہ کہہ کر بدرگاہِ ربِ العزت اپنی ریاضت کے لئے درخواست گذران دی تھی کہ

باقی نہیں اب میری ضرورت تھے افلک  
جبہور کے ابلیس ہیں ارباب سیاست (بال جبریل)

## 17 اپریل:

صحیح کی نماز مسجد الحرام میں بالخصوص اس مقصد کے لئے ادا کی کہ نور کے تڑکے، اس کی ایمان افروز اور سکون افزائنا فضا سے قلب و نگاہ کو سیراب کر سکوں لیکن بجلیوں کی خیرگی نے اس مسحور کن فضائے باریاب نہ ہونے دیا۔ اے کاش! کوئی اس فضا کی نورانیت کو سمجھ سکتا اور فخر سے پہلے اس مصنوعی روشنی کی جگہ فطرت کی جوئے نور کو اذن آئینہ پاشی دیتا!

## رہ بُطھا گرفتہم

مکہ میں مناسک عمرہ ادا کرنے، اور ان مقامات کی زیارت کرنے کے بعد جن تک ویزا کی پابندیوں کے اندر رہتے ہوئے، رسائی ممکن تھی، دیارِ حبیب ﷺ سے تطہیر قلب و نگاہ کی آرزو شدت اختیار کر رہی تھی۔ چنانچہ 17 اپریل ہی کی سر پہر ہمارا کاروان شوق جانب بُطھا جادہ پیا ہو گیا۔ حوالی مکہ سے باہر نکلتے ہی وہ پہاڑی نظر آئی جس پر غارِ حراء قعہ ہے۔ پہاڑی خاصی اونچی ہے اور غارتک بینچے کے لئے کوئی راستہ نہیں بنایا گیا۔ اس لئے اس تک پہنچانے کیا۔ اور ہم آگے روانہ ہو گئے۔

جو کچھ انسانی ہاتھوں نے بنایا ہے، اسے چھوڑ کر، مکہ سے مدینہ تک (قریب تین سو میل) کا راستہ اسی قسم کے پہاڑوں۔ صحراؤں بے برگ و گیاہ میدانوں۔ بیابانوں اور ویرانوں پر مشتمل ہے جس کا میں نے جدہ سے مکہ تک کے راستے کے ضمن میں ذکر کیا ہے۔ البتہ اس راستے میں کہیں کہیں بہتا پانی نظر آیا جس کے متعلق بتایا گیا کہ حال ہی میں بارش ہوئی ہے۔ کہیں کہیں سبزہ بھی دکھائی دیا۔ لیکن یہ سب ویرانیاں خارجی ماحول سے متعلق تھیں۔ ہماری داخلی دنیا میں فوری شوق سے جو جنتیں اُبھر رہی تھیں ان کی عکہت پاشیوں نے اس ماحول کو نگاہوں سے یکسر اوجھل کر رکھا تھا۔ اور اس کی جگہ کچھ اور ہی نگاہ کے سامنے تھا۔

چہ خوش صحرا کہ شامش صحح خدا است      شبش کوتاہ و روز او بلند است

قدم اے راہرو! آہستہ تر نہ      چوما، ہر ذرہ او درد مند است!

(ارمغانِ حجاز)

مسافت سمعتی جا رہی تھی اور میں اس قسم کے خیالات میں مستغرق تھا کہ آج اس راستے میں ہموار پنٹہ سڑک ہے۔ کہیں کہیں آبادیاں بھی ہیں۔ منزلیں بھی ہیں جہاں سامان خورہ و نوش بھی میسر ہے۔ نہ رہنوں قراقوں کا ڈر ہے، نہ درندوں کا خوف۔ لیکن وہ کیا کشش تھی جو آج سے چودہ سو سال پہلے، مہاجرین سابقوں کے بے ساز و سامان تاقلوں کو ان وحشت زا اور دہشت خیز ریگستانوں اور ویرانوں میں روای دواں لئے چلی آتی تھی! کشش ایک بلند و بالا مقصد کے حصول کی۔ قوت ایک مستحکم ایمان کی!

## شہدائے بدر کے مزار:

ذرا آگے بڑھ تو کسی نے یہ نشید جانفرسانی کہ یہاں شہدائے بدر کے مزار ہیں۔ سوچئے کہ اس کے بعد کس کا قدم آگئے اٹھ سکتا تھا؟ لیکن وہاں جا کر جو کچھ دیکھا اس کے متعلق اس سے زیادہ کیا عرض کروں کہ

مرا درد لیست اندر دل، اگر گویم زبان سوزد      و گرم در کشم، ترسم کہ مغز استخوان سوزد

ایک چار دیواری کے اندر بے ہنگم بکھرے ہوئے پتھر۔ نہ کوئی مزار۔ نہ کسی مزار کی تختی!

آگے بڑھے تو دیارِ حبیب ﷺ کی روش شعیں وجہ فروغ دیدہ ہوئیں۔ دل تڑپ تڑپ اٹھا۔ نہیں کہہ سکتا کہ وفورِ جذبات سے مجھ پر کیا گذرتی اگر میرا شعورِ میری یاوری نہ کرتا اور مجھے چودہ سو سال پیچھے لے جا کر، اس فردوں آفرین منظر کو سامنے نہ لے آتا جب حضورِ نبی اکرم ﷺ بھارت کے وقت قرب مدینہ میں جمال افروز ہوئے تھے اور مدینہ کے سعادتمند انصار ﷺ نے والہانہ انداز سے حضور ﷺ کا استقبال کیا تھا۔ چالیس سال پہلے میں نے اس منظرِ جانفرزا کو ان الفاظ میں پیش کرنے کی سعادت حاصل کی تھی:

**بھارتِ نبوی ﷺ:**

اس طرح رواں دواں، نور و گہرت کی ہزار دنیا نئیں اپنے جلو میں لئے یہ قافلہ جذب و سرورِ مدینہ کی طرف بڑھتا گیا۔ اور 8 ربیع الاول (23 ستمبر) کی صبحِ مدینہ کے قریب جا پہنچا۔ مشتاقین کی جماعتِ حسب معمول انتظار کے بعد واپسِ لوٹ چکی تھی۔ ایک یہودی نے دور سے دیکھا تو قرآن و آثار سے معلوم کر لیا کہ وہی قافلہ ہے جس کے انتظار میں اتنے دنوں سے انصار کی آنکھیں فرش راہ بن رہی ہیں۔ اس نے آواز دی کہ ”ابلی عرب! الجس کا تم انتظار کر رہے ہے تھوڑا آگیا۔“ تمام شہر اللہ اکبر کے نعروں سے گونج اٹھا اور انصارِ تھیار سچ کر بے تبانہ گھروں سے نکل آئے اور پرواہ وار اس آواز کی سمیت بڑھے۔ مدینہ سے تین میل کے فاصلہ پر انصار کے کچھ خاندان آباد تھے۔ اس بستی کو قباء کہتے ہیں۔ حضور ﷺ یہاں پہنچے تو افراد خاندان نے جوشِ مسرت میں نعرہ ہائے تکبیر بلند کئے۔ ان کے مقدار نے یاوری کی اور حضور ﷺ نے ان کی میزبانی قبول فرمائی۔ یہاں سب سے پہلا کام مسجد کا تعمیر کرنا تھا اس لئے کہ نظامِ خداوندی کا مرکز ہوتی ہی مسجد ہے۔ یہ مسجدِ قباء تھی۔

چودہ (14) دن کے بعد آپ شہر کی طرف روانہ ہوئے راہ میں بنی سالم کے محلہ میں جمجمہ کی نمازِ ادا فرمائی۔ یہ اس سر زمین میں جسے حکومتِ خداوندی کا گھوارہ بننا تھا، جماعتِ مؤمنین کا پہلا اجتماع تھا۔ کس قدر حسین تھی یہ ابتداء! قباء سے مدینہ تک راستہ میں دور و یہ فدائیں صاف تھیں۔ سارا شہر جوشِ مسرت اور فرطِ عقیدت سے معمورہ جذب و نشاط اور گھوارہ حسن و بہار بن رہا تھا۔ گلی گوچوں سے خدا کی حمد و ستائش کے نغمے اور تشكرو امتنان کے زمزے ساری فضا کو کیف بار اور مسرت بیز بنا رہے تھے۔ جوشِ استقبال سے قبور کے ساغر اس طرح بے محابا چلک رہے تھے کہ سہبائے محبت، مسرت و ابہتاج کے نورانی آنسوؤں کی شکل میں دامان و آستین کو صحنِ گلستان و کفِ باغبان بنارہی تھی۔ کہیں جیسی ہائے نیاز بحضورِ ربِ ذوالمنون سجدہ ریزو زمین یوس تھیں اور کہیں بھومِ جذبات سے مرتفع ہاتھ تھے کہ بارگاہِ صمدیت میں اس مہمان ﷺ کی خیر سکالی اور خوش بختی کی حسین دعا نئیں اور معصومِ التجا نئیں لئے ہوئے یوں جانبِ عرشِ عظیم اٹھ رہے تھے جیسے خاموش صحرائیں خیل بلند ایستادہ۔ خاکِ یثرب کے ذرات ابھرا بھر کر ہمہ تن دید بن رہے تھے کہ آج انہیں اس ذاتِ اقدس و عظیم ﷺ کی کفش بوسی کی سعادت نصیب ہونے والی تھی جو تمامِ عالم کے لئے سرمایہ فخر و ناز تھی۔ چھوٹی چھوٹی بچیاں جوشِ مسرت میں دف بجا تین اور یہ استقبالیہ نغمہ گاتی تھیں کہ

طلَّعَ الْبُدْرُ عَلَيْنَا  
وَجَبَ الشُّكُورُ عَلَيْنَا

خلوص ومحبت کے ان روح پرور نظاروں میں یہ کاروان حسن و خوبی یہ رب کی وادی میں داخل ہوا جس کا نام اس کے بعد ” مدینۃ النبی ” ہو گیا۔ ہر شخص منتظر تھا کہ دیکھیں حضور ﷺ کی میزبانی کی سعادت کس کے نصیب ہوتی ہے۔ یہ شرف حضرت ایوب انصاری رضی اللہ عنہ کے مقدار میں تھا۔ جہاں اب مسجد نبوی ﷺ ہے۔ حضرت ایوب ﷺ کا مکان اس سے متصل تھا۔ حضور ﷺ وہیں فروکش ہو گئے۔

(معراج انسانیت، ص: 223)

رات کے قریب دو بجے، جوارِ مدینہ میں داخل ہوئے تو بے ساختہ میری زبان پر تھا  
پایم بہ پیش از سرِ ایں کو نبی روڈ! یاراں خبر دہید کہ ایں جلوہ گاہ کیست؟  
اور رفقائے سفر سے اتنا کہہ سکا کہ

بیا اے ہم نفس!	باہم بنالیم
دو حرف بر مراد دل گوئیم!	پائے خواجہ چشمائ را بمالیم

(ارمغانِ حجاز)

قلبی کشش بے پناہ تھی لیکن میری حالت کو دیکھتے ہوئے احباب نے یہی مناسب سمجھا کہ میں اس وقت روشنہ اطہر کی جاروب کشی کے لئے نہ جاؤں۔ اس میں شبہ نہیں اس سفر کو میرے لئے پُر آسائش بنانے کے لئے تمام احباب نے اپنی اپنی جگہ بڑی دل دوزی سے کام لیا لیکن انہی مکرم میاں ظفر محمود کی نگاہ ہمیشہ میرے دل پر رہتی تھی۔ یہ حقیقت ہے کہ اگر وہ مجھے نازک اور مشکل مقامات پر نہ تھا متنے تو معلوم میں کس وقت ڈھیر ہو کر رہ جاتا۔ میں ان کی اس عنان گیری کا کس زبان سے شکریہ ادا کروں؟ اور 18 اپریل کی صبح دس بجے میں (رفقاء کی معیت میں) مسجد نبوی ﷺ میں گنبدِ خضری کے سامنے سر گنوں کھڑا تھا!

کہاں میں! کہاں یہ مقام!! — اللہ! اللہ!

میں آنکھیں بند کئے کھڑا تھا کہ یہاں یک علامہ اقبال عالم تصور میں سامنے آگئے۔ وہ ساری عمر دیا رنبوی ﷺ کی خاک بوئی کی آرزو کو حرزِ جاں بنائے رہے۔ جنوری 1938ء کی آخری ملاقات کا وہ جگر پاش منظر مجھے کبھی نہیں بھولتا جب علامہ اسلم جیراچپوری نے ان سے کہا کہ آپ کا حجاز مقدس جانے کا ارادہ تھا؟ فرمایا کہ عالم تصور میں تو میں دن رات انہی راستوں میں رہتا ہوں لیکن اس بیماری میں یہ آرزو برآتی نظر نہیں آتی۔ یہ کہا اور ان پر غشی کا ساعاں م طاری ہو گیا۔ دورہ اس قدر جانکاہ تھا کہ (سید نذیر نیازی مرحوم کے ایسا پر) یہی مناسب سمجھا کہ مغلب برخواست کردی جائے۔ میں سوچتا تھا کہ حضرت علامہ اس آرزو کو دل میں لئے عالم جاوداں کی طرف تشریف لے گئے اور میں کس قدر خوش بخت ہوں کہ میری آرزو یوں پوری ہو رہی ہے۔ میں دل ہی دل

میں یہ بتیں کر رہا تھا اور بارگاہِ رسالتِ مکتب علیہ السلام میں نذرانہ عقیدت پیش کرنے کے لئے علامہ ہبی کے یہ اشعار میری زبان پر تھے کہ

اے ظہورِ تو شبابِ زندگی	جلوہ ات تعییرِ خوابِ زندگی
اے زمیں از بارگاہتِ ارجمند	آسمان از بوستہِ بامت بلند
از تو بالا پایہ ایں کائنات	فقرِ تو سرمایہ ایں کائنات
در جہاں شمعِ حیاتِ افروختی	بندگان را خواہی آموختی!

(مثنویِ رموز و اسرار)

پھر حاضری کی سعادتِ نصیب ہوئی۔ تو ملتِ اسلامیہ کا درود سینے میں امنڈ آیا اور عرض کرنے کی جرأت کی کہ  
ہنوز ایں چرخِ نیلی کجھِ خرام است  
تو می دانی کہ ملت بے امام است!  
زکارِ بے نظامِ او چہ گویم!  
اور کبھی یہ کہ

نگہبانِ حرمِ معمارِ ویز است	یقینیشِ مہ ده چشمشِ بغیر است
ز اندازِ نگاہِ او چہ گویم!	کہ نو مید از ہمہ اسبابِ خیر است

(ارمغانِ حجاز)

الترزام یہ رکھا کہ نماز میں امام کے قریب تر جگہ مل جائے کہ حضور علیہ السلام جس محراب میں جلوہ افروز ہوا کرتے تھے، وہ اس کے قریب ہی تھا۔ اس سے عالمِ تصور قلبی تسلکین کا سامان فراہم کر دیتا تھا۔  
کسی نے مکہ اور مدینہ کے لئے جن تعلیمی الفاظ کا لاحقہ تجویز کیا تھا وہ معنویت کے اعتبار سے بڑا بلیغ تھا۔ یعنی مکہ معظیمہ اور مدینہ منورہ۔ مکہ کی عظمت سے ذہن متاثر ہوتا ہے اور مدینہ کی نورانیت سے قلبِ رشکِ طور۔

### 19 اپریل:

مختلف تاریخی مقامات دیکھنے کے لئے نکلے۔ سب سے پہلے مسجدِ قباء کو دیکھا۔ اس کی اہمیت کا اندازہ اس سے لگائیے کہ یہ سب سے پہلی مسجد تھی جسے حضور نبی اکرم علیہ السلام نے ہجرت کے بعد مدینہ سے باہر تعمیر فرمایا تھا۔ چنانچہ اس کے دروازے پر خدا کی یہ شہادت کندہ ہے: لَمَسْجِدٌ أُسِّسَ عَلَى التَّقْوَىٰ مِنْ أَوَّلِ يَوْمٍ۔۔۔ (108:9) لیکن موجودہ مسجد کا صرف محل و قوع وہی ہے۔ مسجدِ حال ہی کی تعمیر کردہ۔ یہی کیفیت ہر تاریخی مقدس مقام کی ہے۔

### مسجدِ قباء:

اس کے بعد جنگِ احمد کے میدان کو دیکھا۔ وہاں بھی پہاڑ توہی ہے لیکن اس کے دامن میں ماڑن بنگلے اور کوٹھیاں آباد

ہیں۔ شہداء کے مزارات کا بھی کوئی نشان نہیں۔ لو ہے کے ایک جنگلے کے اندر چند پتھر کھے ہیں جن کے متعلق کہا جاتا ہے کہ وہ حضرت حمزہ رضی اللہ عنہ کی جائے شہادت (یا مزار) کا نشان ہے۔ وہاں ان معلومات کے حاصل کرنے کا بھی کوئی ذریعہ نہیں۔ اس سے ذرا آگے ”بُنْر عَمَّانِ رَضِيَ اللَّهُ عَنْهُ“ (حضرت عثمان رضی اللہ عنہ کا نوآں) ہے۔ یعنی وہ کنوآں جسے حضرت عثمان رضی اللہ عنہ نے ایک یہودی سے خرید کر اہل مدینہ کی ضروریات کے لئے وقف کر دیا تھا۔ یہ کنوآں، اس کی کہنگی اور ختنگی کے پیش نظر شاید اپنی اصلی حالت میں ہو۔ لیکن اس کی غلطیت، چگاڑیں اور بلیوں کے بچے، ہماری بے حسی کے نوح خواں ہیں۔

### مسجدِ ذوق بنین:

از اس بعد ”مسجدِ ذوق بنین“ دیکھنے لگتے۔ اس مسجد کی داستان دلچسپ بھی ہے اور تاسف انگیز بھی۔ روایات کی رو سے (جو بالبداہت وضیع اور یہودی سازش کا نتیجہ نظر آتی ہے) کہا یہ جاتا ہے کہ مکہ کی تیرہ سالہ (نبوٰت کی) زندگی میں حضور ﷺ، بیت المقدس کی طرف رُک کر کے نماز پڑھا کرتے تھا اگرچہ چاہتے تھے کہ رُخ کعبہ کی طرف کیا جائے۔ اس کے لئے آپ ﷺ نے شکل یا اختیار کی کہ حرم کعبہ میں نماز کے لئے اس طرح کھڑے ہوتے کہ کعبہ بھی سامنے رہے اور بیت المقدس بھی، کونکہ یہ دونوں ایک سیدھ میں پڑتے تھے۔ جب حضور ﷺ مدینہ تشریف لے گئے تو وہاں یہ انداز بنا ہنا مشکل ہو گیا اس لئے کہ اب بیت المقدس (یراثم) اور کعبہ (مکہ) دو مختلف سمتوں میں پڑتے تھے۔ اگر منہ بیت المقدس کی طرف کرتے تو کعبہ کی طرف پشت ہو جاتی اور کعبہ کی طرف رُخ کرتے تو بیت المقدس کی طرف پیچھے ہو جاتی۔ اب اس کے سوا چارہ نہیں تھا کہ آپ ﷺ بیت المقدس کی طرف رُخ کر کے نماز پڑھتے۔ پڑھنے کو تو آپ ﷺ اس طرح نماز پڑھتے، لیکن آپ ﷺ دل سے اُسے پسند نہ فرماتے۔ قریب سترہ ماہ (اوپر بعض روایات کی رو سے، قریب دو سال تک) آپ ﷺ اسی نجح سے نماز ادا فرماتے رہے۔ تا نکہ ایک دن جب آپ ﷺ، ایک غیر معروف سی مسجد میں، ظہر یا عصر کی نماز پڑھا رہے تھے، عین حالت نماز میں خدا کی طرف سے حکم آیا کہ آپ ﷺ کعبہ کی طرف رُخ کر کے نماز پڑھا کریں۔ حکم آنے پر آپ ﷺ نے۔۔۔ (باقی نماز کے لئے) اپنارُخ بدلا اور آپ ﷺ کے ساتھ مقتدیوں نے بھی۔ رُخ بدلنے کا نقشہ اس طرح ذہن میں لایئے کہ اگر پہلے منہ مغرب کی طرف تھا تو اب مشرق کی طرف کرنا پڑا۔ مقتدیوں نے تو رُخ کھڑے کھڑے بدلتا ہو گا۔ لیکن ظاہر ہے کہ امام (حضور ﷺ) کو مسجد کا نصف چکر کاٹ کر، دوسری جانب امامت کے لئے جانا پڑا ہو گا۔ جس مسجد میں (روایات کی رو سے) یہ واقعہ پیش آیا اُسے مسجدِ ذوق بنین کہتے ہیں۔ (یعنی دقبوں والی مسجد) اس سے پہلے، اس مسجد کی بال مقابل دیواروں میں دو محراب تھے۔ ایک کا رُخ جانب بیت المقدس تھا اور دوسرے کا جانب کعبہ۔ نماز تو اُسی محراب میں کھڑے ہو کر پڑھائی جاتی تھی جس کا رُخ جانب کعبہ تھا لیکن مقابل کا محراب بطور یادگار قائم رکھا تھا۔ اب اس دوسرے محراب کی جگہ دیوار پر نشان سادے دیا گیا ہے لیکن مسجد کو ذوق بنین ہی کہا جاتا ہے۔ (میں نے اس کی تفصیل اپنی

کتاب ”مطالب الفرقان“، جلد سوم، ص: 82 میں لکھی ہے جس میں یہ بھی بتایا گیا ہے کہ یہ روایات کس طرح یہودیوں کی سازش کا نتیجہ ہیں۔ حیرت ہے کہ (علاوه دیگر دلائل و شواہد) اتنی سی بات بھی کسی کی سمجھ میں نہیں آئی کہ حضور نبی اکرم ﷺ نے مدینہ میں سب سے پہلے مسجد قباء تعمیر فرمائی اور اس کے تھوڑے دنوں بعد مسجد نبوی ﷺ۔ ان دونوں مسجدوں کا رُخ کعبہ کی جانب ہے۔ اگر حضور ﷺ مدینہ میں ہجرت کے بعد سترہ ماہ یادوں سال تک بیت المقدس کی طرف رُخ کر کے نماز ادا فرماتے رہے تھے تو ان مسجدوں کا محراب اول، جانب بیت المقدس ہونا چاہئے تھا اور دوسرا محراب کعبہ کی سمت۔ لیکن ان مسجدوں میں ایک ہی محراب ہے اور وہ جانب کعبہ ہے۔ اس سے بھی واضح ہے کہ حضور ﷺ ہجرت کے بعد، یومِ اول ہی سے، کعبہ کی سمت رُخ کر کے نماز پڑھا کرتے تھے۔ یہ ایسی محسوس اور واضح شہادت ہے کہ اس کے بعد اس غیر معروف سی مسجد میں، حالت نماز میں تحویل قبلہ کا واقعہ بالکل بے سند وہ چاتا ہے۔ لیکن ہم ہیں کہ چودہ سو سال سے (یا جب سے یہ روایات وضع ہو کر کتب احادیث میں راہ پا گئیں) اس مسجد کو ”ذوبین“، پکارے جا رہے ہیں اور تحویل قبلہ کے اس (وضعی) واقعہ کو مستند تسلیم کئے جا رہے۔۔۔! ایسا کیوں ہے؟ اس لئے کہ اس کی سند وہ روایات ہیں جنہیں وضعی کہنے کی کسی کو جرأت نہیں۔

### جنت ابیق:

ان مقامات کی اہمیت اپنی جگہ ہے لیکن سب سے زیادہ کشش جنت ابیق کی تھی۔ وہ عہد رسالت آب ﷺ اور صحابہ کرام ﷺ کا مدینہ کا سب سے بڑا قبرستان تھا جس میں ازوٰج مطہرات ﷺ جملی القدر صحابہ رضوان اللہ علیہم ہمیں۔ عظیم المرتبت ائمہ وغیرہ مرحوموں کے مزارات کے ساتھ صدر اول کی ساری تاریخ وابستہ ہے اس لئے اس کی اہمیت واضح ہے۔ شام کے قریب کشاں کشاں وہاں گئے اور جس فور عقیدت و احترام سے گئے تھے اس سے ہزار گناز یادہ تاسف ہی نہیں، صدمہ کے ساتھ واپس لوٹے۔ لوہے کی سلاخوں والے دروازے کے اندر ویران پتھروں کا میدان ہے جس میں کوئی مزار تو ایک طرف، کسی مزار کی تختی تک نہیں۔ نہ ہی دروازے کے باہر ان حضرات کے اسماء گرامی کی کوئی فہرست ہے جن کے مزارات کے نشان تک باقی نہیں۔ میر امرض، پریشانی، غم اور صدمات سے بڑھ جاتا ہے۔ اتنے دنوں چلتا پھر تارہ لیکن یہاں پہنچ کر کچھ ایسا صدمہ ہوا کہ چلناؤ ایک طرف، کھڑے رہنا بھی دشوار ہو گیا۔ احباب بمشکل مسجد نبوی ﷺ تک لے کر آئے۔

---

دہرانَ کے احباب نے بڑی کوشش کی وہاں جانے کی اجازت مل جائے لیکن ایسا نہ ہو سکا۔ وہاں کے قرآنی احباب کا ٹیکی فون آتا تھا کہ دہرانَ آنے کا کوئی انتظام کیا جائے لیکن ایسا نہ ہو سکا اور انہیں (اور ان کے ساتھ مجھے بھی) بڑی مایوسی ہوئی۔ اسی طرح ریاض کے احباب کو بھی۔ 20 اپریل کی صبح، عزیزم خالد حیدر واپس روانہ ہو گئے۔ آخری دنوں حسنِ اتفاق سے، چوہدری محمد رمضان صاحب کی احباب کویت سے ملاقات ہو گئی۔ یہ بھی وہاں ہوتے تھے۔ آج کل جدہ میں ہیں۔ بیوی

پچوں سمیت، مختصر سے قیام کے لئے مدینہ آئے تھے۔ بڑے خلوص اور محبت کے پیکر۔ اگرچہ وہ بھی ہماری طرح مدینہ میں اجنبی تھے، لیکن انہوں نے مجھ مریض کے آرام اور آسائش کے لئے اتنا کچھ کیا جو پیکر غیر متوقع تھا۔ یہاں سے روانہ ہو گئے تو جدہ کی شب بھی اسی میزبانی کا حق ادا کیا۔ قرآن کا رشتہ بھی کس قدر پر خلوص اور گہرا ہوتا ہے۔

### 121 اپریل:

آج اس رحمتوں کے سرچشمہ میں، (جسے اقبال نے اے خنک شہرے کہ آں جادل براست کہہ کر پکارا تھا) قیام کا آخری دن تھا اور اس احساس سے دل بوجھل ہو رہا تھا۔ میں نے اس شہر کی گلیوں کی حرمت اور تقدس کے متعلق قریب چالیس سال پہلے جو کچھ کہا تھا، اس کی یاد ہن میں تازہ ہو رہی تھی۔

ہوا یوں کہ امریکہ کے ایک دریڈہ دہن اخبار نے حضور ختمی مرتب (علیہ الصلوٰۃ والسلام) کی شانِ اقدس واعظم میں کچھ نازیبا الفاظ کہے۔ جس کے خلاف، سر عبد الحلیم غزنوی (مرحوم) نے اسمبلی میں التوا کی تحریک پیش کی۔ لیکن حکومت نے اسے چند اس اہمیت نہ دی۔ اس پر میں نے، قلم خونچکاں سے لکھا کہ

### مدینہ کی گلیاں:

دنیا کو شاید ابھی معلوم نہیں کہ ایک مسلمان کے نزدیک، جس کے دل میں ایمان کی کوئی کرن بھی موجود ہے، حضور سرور دن عالم ﷺ کی قدر و منزلت کیا ہے۔ وہ ذاتِ گرامی ﷺ (فداہ ابی و امی) جن پر ایمان ہمارے لئے باعثِ نجات و سعادت اور جن کی محبت سرمایہ زندگی اور متابعِ حیات ہے، ہمارے نزدیک معراجِ انسانیت کا مظہرِ اتم، اور دنیا کی بلند ترین سرفرازیوں کا پیکرِ مقدس ہے۔ اس ذاتِ فخر موجودات کی شان میں نازیبا الفاظ تو کجا، ہم تو ان کو چوں اور گلیوں کی توہین بھی برداشت نہیں کر سکتے جن کے ذرات کو اس پیکرِ رفت و عزت کی لفظ بھی کی سعادتِ نصیب ہو گئی۔ خوش بخت ہیں وہ را ہیں جن میں وہ شمع فروزاں، ضیاباً و جلوریز ہوئی، اور زہرے نصیبِ خاک کے ان ذروں کے جوان درخشندہ و تابناک نقوشِ قدم کے چومنے سے آسمان کی بلندیوں پر پہنچ گئے۔ دنیا کیا جانے کہ اس پیکرِ محبو بیت ﷺ کے ساتھ ہمارا کیا رشتہ ہے۔ ایک زندگی کیا، ہزار بار زندگی نصیب ہو اور ہزار بار اس شاہنشاہ کو نین ﷺ کی ناموس پر پچھا رہو جائے تو بھی دل کی تمنا برلنہ آئے۔ جس سینے میں عشقِ رسول ﷺ کا سوزن نہیں، سینہ نہیں۔ بد بختیوں اور تارکیوں کا قبرستان ہے۔ جس دل میں ناموسِ محمد ﷺ پر مر منٹنے کی تمنا نہیں، دل نہیں، بوم و کرس کا وحشت انگریز نہیں ہے۔

### الوداع:

آج ان گلیوں کو الوداعی سلام کہنے کا وقت آگیا۔ عصر کی نماز، امام کے عین پیچھے ادا کی۔ پھر بارگاہ رسالتِ اب ﷺ میں آخری حاضری کے لئے جو کھڑا ہوا ہوں تو کچھ یاد نہیں پڑتا کہ دل کی کیا حالت تھی۔ لیکن وہ جو کہتے ہیں کہ

دیوانہ بکارِ خویش ہوشیار۔۔۔ اس محیت میں بھی اقبال کی وہ دعاء بے ساختہ زبان پر آگئی جسے میں برسوں سے دھرا تا اور لکھتا چلا آ رہا ہوں کہ۔۔۔

گر دلم آئینہ بے جوہر است  
پردا ناموں فرم چاک کن  
ایں خیابان راز خارم پاک کن!  
روزِ محشر خوار و رسوا کن مرا  
بے نصیب از بوئے پاکن مرا

اور۔۔۔

گر در اسرارِ قرآن سفتہ ام  
عرض کن پیش خدائے عزوجل  
عشق من گردد ہم آغوش عمل  
در عمل پائندہ تر گردان مرا آب نیسانم گہر گردان مرا

ان آرزوں اور تمناؤں کے اظہار کے ساتھ وہاں سے خصت ہوئے۔

رات 8 بجے کے جہاز سے روانہ ہو کر، 9 بجے کے قریب جدہ آگئے۔ میر محمد احقیقی اور چوہدری محمد رمضان صاحب کے حسنِ انتظام کے تصدق، رات، الواحہ ہوٹل میں بڑے آرام سے بسر کی۔ 22 اپریل، بارہ بجے کے جہاز سے روانہ ہو کر، چار بجے کے قریب کویت پہنچ گئے۔ جہاں قرآنی احباب ایئر پورٹ پر موجود تھے۔

لیکن قبل اس کے کہ میں کویت کی روئنداد پیش کروں، سفرِ جہاز کا ایک قرض میرے ذمے ہے جس کا اتنا ضروری ہے۔۔۔ میں قدم قدم پر یہ کہتا چلا آ رہا ہوں کہ وہاں، میری آنکھیں جو کچھ دیکھنے کو ترسی تھیں، ترسی رہ گئیں۔ وہ کیا تھا جسے دیکھنے کے لئے وہ ترسی رہ گئیں؟

ترستی ہوئی آنکھیں:

اس میں شہر نہیں کہ جب مسلمان عازمِ جہاز ہوتا ہے تو اس کا اولین مقصد حج یا عمرہ کا فریضہ ادا کرنا ہوتا ہے۔ لیکن اس کے ساتھ اس کے دل میں یہ آرزو بھی موجز نہ ہوتی ہے کہ ان شہروں کو دیکھیں جن میں حضور ﷺ اور صحابہؓ کبارؓ بستے تھے۔ ان مکانوں کو دیکھیں جن میں وہ فردش تھے۔ مکہ اور مدینہ کی ان گلیوں اور راستوں کو دیکھیں جن پر ان کے نقوش پا ثابت ہوئے تھے۔ ان میدانوں کو دیکھیں جن میں عالمگیر انقلاب کی جنگیں بڑی گئی تھیں۔ اس زمانے کی تہذیب و تمدن کے آثار کو دیکھیں۔ ان کے اندازِ بودو ماند کا مشاہدہ کریں۔ ان مساجد کو دیکھیں جن سے لا الہ الا اللہ کا باطل شکن نعرہ سب سے پہلے بلند ہوا تھا اور جو محمد رسول اللہ ﷺ کی رسالت کی اولیں شہادت گاہ بنی تھیں۔ یہ سب کچھ دیکھنے کی آرزو دل میں لے کر مسلمان وہاں جاتا ہے۔ لیکن اسے وہاں ان میں سے کوئی چیز بھی نظر نہیں آتی۔ اس میں شہر نہیں کہ، تعمیر و تحسین اور جلال و جمال کے اعتبار سے مکہ اور مدینہ کا شمار دنیا کے عظیم ترین شہروں میں ہوتا ہے وہاں کی سربائلک عمارت، نیو یارک اور وشنگٹن کو مات کرتی

ہیں۔ وہاں کی مساجد، ماڈرن طرز تعمیر کا بہترین نمونہ ہیں۔ حرمیم کعبہ اور مسجد بنوی ﷺ کی آرائش وزیارتیں پر کروڑوں دینار صرف ہوئے ہیں (اور ہورہے ہیں) لیکن مسلمان تو ان مٹی کے مکانوں اور بھجور کے بتوں سے مسقّف مسجدوں کو دیکھنے کی آرزو لے کر جاتا ہے جن کے ذریعے ذریعے سے اسے عشق ہے۔ ان یادگاروں کو ان کی اصلی شکل میں دیکھنے سے انسان کے دل پر جواہر ہوتا ہے اس کا اندازہ نہیں لگایا جاسکتا۔ جو قویں اس کی اہمیت کو جانتی ہیں، وہ اپنے آثارِ قدیمہ کی حفاظت کے لئے ہر ممکن کوشش کرتی ہیں۔ ڈور کیوں جائیے۔ ہم موہن جوڈا روکے ہندُر رات کی حفاظت کے لئے لاکھوں روپے خرچ کرتے ہیں۔ (اور دنیا کی دیگر اقوام بھی اس میں مدد و معاون ہوتی ہیں) حالانکہ موہن جوڈا روکا ہم سے اتنا ہی تعلق ہے کہ تقدیم ہندکی لکیر کھینچتے وقت، وہ ہماری طرف آگیا۔ ارضِ حجاز کے ان مقدس آثار میں سے کچھ بھی اپنی اصلی حالت میں محفوظ رکھے جاتے تو اس سر زمین کی کیفیت ہی کچھ اور ہوتی۔ میں اس تلاش میں ماراما پھر تارہ کہ وہاں کوئی دیوار تک بھی ایسی نظر آجائے جو اسلام کے صدرِ اول کی یادگار ہو۔ ایک دن کسی نے کہا کہ فلاں مقام پر وہ مکان ہے جس میں حضورِ حستِ دو عالم ﷺ کی ولادت ہوئی تھی۔ رواں دواں وہاں پہنچا تو دیکھا کہ وہاں ایک لائبریری ہے۔ یعنی اس مکان کی جگہ ایک جدید عمارت تعمیر کی گئی ہے جس میں لائبریری قائم ہے۔ لیکن میں جانتا ہوں کہ اب اس نوح خوانی سے کچھ حاصل نہیں۔ جیسا کہ میں نے پہلے کہا ہے، یہ آثار تو ایک طرف، وہاں ان کی نشاندہی کے لئے تختیاں تک بھی نہیں۔ اس نقصان کا اب ازالہ ہوئی نہیں سکتا۔ جو آثار معدوم ہو چکے ہوں، وہ واپس کیسے آسکتے ہیں؟ اب تو سب سیل تنزل اتنا ہی ہو سکتا ہے کہ تاریخ اور علم الآثار کے محققین سر جوڑ کر بیٹھیں۔ ان یادگاروں کی جو تفاصیل میراً نہیں ان کے مطابق ان کے نقشے مرتب کئے جائیں۔ مکہ معظمہ یامدینہ منورہ کے فریب و جوار میں، ڈزنی لینڈ کے انداز کا وسیع و عریض عجائب گھر قائم کیا جائے، جن میں ان نقشوں کے مطابق ان مقدس یادگاروں کے مشتمل تعمیر کر کے رکھے جائیں۔ اس سے کم از کم ذوقِ نظر کی تسلیم تو ہو جائے گی۔

میں نے اپنے احساسات کے اس حصے کو اس لئے قلم بند کرنا ضروری سمجھا ہے کہ (آج نہیں تو شاید کل) کسی کو اس تجویز کی اہمیت کا احساس ہو جائے اور کوئی جماعت یا مملکت، اس منصوبے کو بروئے کار لانے کی سعادت حاصل کر لے۔

آگے بڑھنے سے پہلے میں اتنا عرض کر دوں کہ میں نے اپنی مختلف تصنیفات (باخصوص مطالب الفرقان، حصہ سوم) میں، کعبہ، حج، عمرہ اور ان سے متعلق مناسک کے متعلق تفصیل سے لکھا ہے کہ دین (اسلامی نظام) کے پروگرام میں ان کی اہمیت کیا تھی اور ان سے کس قدر انقلاب آفریں متوجہ مرتب ہوتے تھے۔ اور اب ("ذہبِ اسلام" میں) ان کی حیثیت کیا رہ گئی ہے۔ اس کے باوجودہ میں اس کی تاکید کیا کرتا ہوں کہ (اُن جزئیات کو چھوڑ کر جو قرآن کے خلاف ہوں) ان کا باقی رکھنا کیوں ضروری ہے۔ سردست (کم از کم) ان سے ہمارا ملی تشخص تو قائم ہے۔ ان کے ساتھ، میں یہ بھی تاکید کیا کرتا ہوں کہ ہمیں قرآنی نظام کے قائم کرنے کے لئے کوشش کرنی چاہئے، جس کا قدم اولین وہ تعلیم ہے جس سے قلب و دماغ میں صحیح تبدیلی پیدا ہو۔ یہ اس لئے کہ اس قسم کی تبدیلی کے بغیر، قرآنی نظام کا قیام ناممکنات میں سے ہے۔ دعا کے مفہوم کے متعلق بھی

میں، مطالب الفرقان میں (دعا اور تقدیر کے عنوانات کے تحت) تفصیل سے لکھ چکا ہوں۔ پھر یہ بھی واضح رہے کہ ان دیوار و احصار کی کشش و جاذبیت کا سبب ان کے اینٹ اور پتھرنہیں، بلکہ یہ ہمارے اپنے جذبات کا مظاہر ہے۔ جس قسم کے ہمارے جذبات اسی قسم کا ان ائمتوں اور پتھروں کا تاثر، اس نکتہ کیوضاحت کسی دوسرے وقت کی جائے گی۔

### کویت:

کویت میں ہمارا قیام، عزیزم عمر دراز خان کے مکان پر ہوا جہاں مجھے اپنے گھر کی سی راحت میسر آگئی۔ کویت میں میری قرآنی فکر کا چرچا تو ایک عرصے سے ہو رہا تھا، لیکن اس سے پہلے مجھے اس کا قطعاً اندازہ نہیں تھا کہ اس کا دائرہ اس قدر وسیع ہو چکا ہے۔ اس آواز کے نقیب احباب میں سے چند ایک سے لاہور میں ملاقات ہوئی تھی۔ باقیوں سے یہاں آ کر ہی ملا اور یہ دیکھ کر بڑی خوشی ہوئی کہ ان کا ذہن بڑا روشن اور فکر بڑی تباہ ہے۔ عمر دراز صاحب کے مکان پر ملنے والوں کا تانتا بندھار ہتا تھا اور (یہ دیکھ کر مجھے اور بھی مسرت ہوئی کہ) ان میں خواتین کی تعداد بھی کافی تھی۔ یہ تمام احباب، میرے خطابات اور درس تو (ٹیپ کے ذریعے) مسلسل سنتے چلے آ رہے تھے۔ اس لئے طے یہ پایا کہ (کسی خطاب کے بجائے) سوال وجواب کا سلسلہ زیادہ مفید رہے گا، تاکہ جسے کسی نکتہ کیوضاحت مطلوب ہو۔ کسی شبکہ ازالہ درکار ہو، کسی اجمالی کی تفصیل مقصود ہو، وہ بالمشافہ دریافت کر لے۔ یہ انداز افہام و تفہیم بڑا مفید رہا۔ عمر دراز صاحب کے مکان کے علاوہ، دو جگہ اور بھی اجتماعات منعقد ہوئے۔ ایک عزیزم عبد الرحمن ارائیں کے مکان پر۔۔۔ ان کا نام نوک قلم پر آتے ہی ماضی کی چند حسین یادوں کے درپیچہ کھل گئے۔ غالباً 1950-1951ء میں، میں نے کراچی میں جب درس قرآن کا سلسلہ شروع کیا تو اس کی صورت یہ تھی کہ نیپر بیر کس، فاؤنڈر لزلائن کے مکان کے چھن میں پیپل کے ایک درخت کے نیچے، دو ایک چار پائیاں بچھا دی جاتی تھیں اور تین یا چار سامعین ان پر آ کر بیٹھ جاتے تھے۔ ان سابقوں الاؤں میں، (ڈاکٹر سعید مرحوم کے علاوہ، دو جگہ ایماء پر درس کا یہ سلسلہ شروع کیا گیا تھا) عبد الرحمن ارائیں نامی ایک صاحب بھی شریک ہوتے۔ ان کے ساتھ ان کے (چھوٹی چھوٹی عمر کے) صاحبزادے بھی آتے۔ اس ابتداء اور اس کے بعد ان کی تربیت سے ان بچوں کے قلب میں فہم قرآنی کا ایسا نتیجہ بویا گیا کہ وہ وقت کے ساتھ شاخ شمردار بنتا چلا گیا۔ ان میں سب سے بڑا بیٹا، عزیزم عطاء الرحمن ارائیں (انجینئر) لاہور میں مقیم ہے اور فکر قرآنی کا نہایت متنیں اور بالسیفہ مبلغ۔ دوسرے دو بیٹے، عبد الرحمن ارائیں (انجینئر) اور عقیق الرحمن (ڈاکٹر) کویت میں ہیں، اور فکر قرآنی سے وابستہ۔ انہی عبد الرحمن ارائیں کے مکان پر ایک جماعت ہوا۔۔۔ جس میں اپنے خاصے روشن خیال، ارباب فکر و دانش شریک تھے۔ ایک اجتماع محترم شفیق صاحب کے مکان پر ہوا، جو سفرِ حجاز میں شریک کارواں تھے۔ یہ اجتماع بھی بڑا کامیاب تھا۔ ان اجتماعات سے مجھے اندازہ ہوا کہ اب یہ قرآنی فکر (بفضلہ تعالیٰ) ارباب علم و بصیرت کے دلوں میں گھر کر رہی ہے، اور یہی درحقیقت اس کے صحیح مسکن ہیں۔ اس کا سہرا عزیزم عمر دراز خان، اور ان کے قدیم رفقاء کے سر پر ہے جنہوں نے نہایت الترام اور استقامت سے اس چراغ کو روشن رکھا ہے۔ اللہ تعالیٰ ان کی

مسائی میں مزید برکت عطا فرمائے۔

دہران کے قرآنی احباب کو میرے وہاں نہ جاسکنے کا جس قدر افسوس ہوا اس کا اندازہ اس سے ہوتا تھا کہ قریب قریب ہر روزان کی طرف سے ٹیلی فون آ جاتا تھا۔ ایک دن تو انہوں نے ایسا نظم کیا کہ قریب پندرہ منٹ تک، ٹیلی فون پر، مجھ سے پیغامات حاصل کرتے رہے۔ اللہ تعالیٰ ان کے شوق فراواں کو مزید شاداں عطا فرمائے۔

کویت کے احباب کا تقاضا تو بے پایا تھا لیکن میرے لئے مرکز کی طرف جلد از جلد لوٹنا بھی ضروری تھا۔ میاں ظفر محمود صاحب 25 اپریل کی شب، جانبِ کراچی رو انہ ہو گئے تاکہ (میرے وہاں پہنچنے سے پہلے) وہاں کے انتظامات کا جائزہ لے لیں۔ میں، احباب کویت کو تشنہ کام چھوڑ کر، 26 اپریل کی شب عازِم کراچی ہوا۔ ائیر پورٹ پر، ان کے ہجوم نے یہ کہہ کر مجھے اذن رخصت دیا کہ

و داع و وصل جداگانه لذتے دارد ہزار بار برو، صد ہزار بار بیا

کویت سے کراچی کا سفر بڑا کھنڈن ہے۔ جہاز رات کو وہاں سے روانہ ہو کر، صبح کے وقت کراچی پہنچتا ہے۔ ایک تورات بھر کا جگر اتنا۔ پھر تہائی (کیونکہ رفیق عزیز ظفر صاحب پہلے جا چکے تھے) لیکن یہ عجیب حسن اتفاق ہے کہ میرا خدا، ہر مقام پر میری بے کسی کی شرم رکھ لیتا ہے۔ کویت کے قرآنی احباب میں ایک صاحب (محترم عبد العزیز بھٹی) انگلینڈ سے واپس آئے۔ انہوں نے اپنے وطن (ڈسکر) جانے کے لئے اسی رات کراچی آنا تھا۔ انہوں نے میری روائی کا سنا تو اپنے جہاز میں نشست حاصل کر لی۔ اور ان کی مشققانہ رفاقت نے تہائی محسوس ہی نہ ہونے دی۔ صبح کراچی اترتا تو عزیزم خالد سامنے کھڑا تھا۔

کرائیجی:

تھے۔ پس تقسیم ہند کے بعد، کراچی میرا پہلا وطن تھا۔ میں نے (پاکستان میں) اپنی قرآنی تحریک کی ابتداء بیہیں سے کی تھی۔ 1958ء میں، مستقل طور پر لا ہور منتقل ہو گیا تو (پھر بھی) وقتاً فوقتاً کراچی آنا جانا رہا۔ لیکن اس کے بعد کچھ ایسے مواضع پیش آتے رہے کہ (احباب نے بتایا کہ میں) سترہ سال کے بعد کراچی آیا ہوں۔ اس عرصہ میں کراچی کچھ اس طرح بدی کہ میں اس کے کسی حصے کو بھی پہچان نہ سکا۔ (اللہ الحمد کہ قرآنی احباب کے دلوں میں کوئی تبدیلی نہیں آئی) ڈاکٹر صلاح الدین اکبر کے عزیز، محترم فضل احمد بٹ، کراچی میں مقیم ہیں۔ میں نے انہیں کے ہاں ٹھہر نے کو ترجیح دی۔ کیونکہ ان کا گھر میرے لئے بمنزلہ اینے گھر کے ہے۔ عزیزم خالد بھی وہیں تھے۔ ان کی وجہ سے مجھے اور بھی آرام ملا۔

جیسا کہ میں نے ابھی ابھی کہا ہے، میں نے اپنی تحریک کا آغاز کراچی ہی سے کیا تھا۔ (1958ء میں) جب میں وہاں سے لا ہوئے منتقل ہوا ہوں، تو قرآن کی آواز پھیل رہی تھی لیکن اس کی رفتار قدر سے سست تھی۔ اب یہ دیکھ کر مجھے بے حد سرسرت ہوئی کہ یہاں مختلف مقامات پر قرآنی آواز کے مراکز قائم ہو گئے ہیں۔ بزم طلوع اسلام کراچی کی سرگرمیاں بھی پہلے سے کہیں زیادہ برق پا ہیں۔ میں نے ان سے کہہ رکھا تھا کہ وہ کسی پبلک اجتماع کا انتظام نہ کریں۔ نہ ہی میرے کراچی کے ورونوں کا چر چاکریں، کیونکہ اس صورت میں میرے لئے کراچی سے دامن چھڑانا مشکل ہو جائے گا۔ لیکن اس کے باوجود، تھی اجتماعات

میں بھی شرکاء کی بڑی کثرت تھی۔ (ریثا رڑ) میجر جزل احسان الحق صاحب نے (جن کے ساتھ میرے قدیمی تعلقات ہیں) ایک قرآنی حلقة قائم کر رکھا ہے جس میں اعلیٰ مناصب پر فائز ارباب علم و دانش شریک ہوتے ہیں۔ ان کے ہاں بھی ایک اجتماع ہوا، جس میں خواتین بھی بکثرت شریک تھیں۔ عزیزم منصور ٹبلہ کے ساتھ بھی میرے دیرینہ تعلقات ہیں۔ ان کے ہاں دو اجتماعات ہوئے اور بڑے کامیاب۔ انداز سوال و جواب ہی کا تھا۔ یہ دیکھ کر مجھے خوشی ہوئی کہ اب سوالات، انکار و اقرار حدیث اور تین نمازوں اور نوروزوں سے آگے بڑھ کر زندگی کے عملی مسائل سے متعلق ہو چکے ہیں۔ بالخصوص اسلامی نظامِ مملکت۔ اسلامی قانون سازی۔ اسلامی حکومت۔ اسلامی نظامِ میعشت سے متعلق۔ خواتین کو اگرچہ بر قعہ اور ساڑھی کی کش مکش میں الحجاد یا گیا ہے، لیکن انہوں نے بھی زیادہ تر بچوں کی تعلیم و تربیت سے متعلق سوالات کے۔ مرکز ہرسوال کا قرآن تھا۔

کراچی کے چاروں کے قیام میں، بعض دیرینہ دوستوں سے بھی ملاقات ہوئی۔ میں ان کے نام نہیں لینا چاہتا کیونکہ اگر (سہوا) کسی ایک کا نام بھی لکھنے سے رہ گیا تو انہیں شکایت پیدا ہو جائے گی جو میں قطعاً نہیں چاہتا۔ یہ تمام دوست بڑے مخلص اور میرے لئے یکساں واجب الاحترام ہیں۔ خدا ان سب کو خوش و خرم رکھے۔ ان کے ساتھ میرے ماضی کی بڑی حسین یادیں وابستہ ہیں۔ ملازمت کی زندگی تحریک پاکستان کی زندگی۔ تشكیل پاکستان کی زندگی۔

130 پریل کی شب، احباب کو با چشم غم چھوڑ کر، لا ہور کے لئے روانہ ہوا۔ عزیزم خالد سلمہ (بیوی بچوں سمیت) اس سفر میں بھی میرے لئے عصائے پیری تھا۔ دس بجے شب، ایسرپورٹ پر جملہ اہل خانہ کو خوش و خرم موجود پایا۔

شکر یہ:

جیسا کہ میں نے شروع میں کہا ہے، اس سعادت کے حصول کی آرزو ساری عمر میرے سینے میں مچلتی رہی۔ عمر کے اس آخری حصہ اور صحت کی خرابی، نیز حادث کے صدمات کی بناء پر، میں اس کی طرف سے اب مایوس ہو چکا تھا، کہ مبداء فیض کی کرم گسترشی نے، یکسر غیر متوقع طور پر ایسے اسباب پیدا کر دیئے جن سے زندگی کی یہ دیرینہ آرزو، اس حسن و خوبی سے برآئی جو میرے سان گمان میں بھی نہ تھا۔ اس کے لئے سب سے پہلے میں بارگاہ رب العزت میں سجدہ ریز ہوں۔ اور اس کے بعد ان تمام احباب کا به صمیم قلب شکر گزار جن کی محبت، شفقت اور رفاقت سے یہ مراحل ایسے پُر آسانش طور پر طے ہو گئے کہ مجھے صعوبتِ سفر کا احساس تک نہیں ہوا۔ زندگی میں ایسے پُر خلوص احباب کا میسر آجانا بجائے خویش، نعمتِ غیر متربہ ہے۔ اللہ تعالیٰ ان احباب کو خوش و خرم رکھے اور زندگی کے ہر بلند مقصد میں کامیاب و کامران فرمائے۔

اگر اس کا کوئی صلد مانا ہے تو میں بحضور ربِ کریم گزارش کروں گا کہ۔

مرے قافلے میں لٹا دے اسے      لٹا دے، ٹھکانے لگا دے اسے  
کہ یہ حاصل، انہی کی کاوشوں اور کوششوں کا نتیجہ تھا۔

رَبَّنَا تَقَبَّلْ مِنَّا إِنَّكَ أَنْتَ السَّمِيعُ الْعَلِيُّمُ

رہیں مُنْت: پرویزہ

بِسْمِ اللّٰهِ الرَّحْمٰنِ الرَّحِيْمِ

سورۃ البقرۃ آیات 228 تا 233

# درس قرآن

وَالْمُطْلَقُ يَتَرَبَّصُ بِأَنفُسِهِنَّ ثَلَاثَةٌ قُرُوْءٌ وَلَا يَجِدُ لَهُنَّ أَنْ يَكْتُمُنَ مَا خَلَقَ اللَّهُ فِي أَرْحَامِهِنَّ إِنْ كُنَّ يُؤْمِنُنَّ بِاللَّهِ وَالْيَوْمِ الْآخِرِ وَبِعُولَتِهِنَّ أَحَقُّ بِرَدْهَنَ فِي ذِلِّكَ إِنْ أَرَادُوا إِصْلَاحًا وَلَهُنَّ مُشْكُنٌ مُشْكُنٌ عَلَيْهِنَّ بِالْمَعْرُوفِ وَلِلرِّجَالِ عَلَيْهِنَّ دَرَجَةٌ وَاللَّهُ عَزِيزٌ حَكِيمٌ ﴿٢٣٣﴾ الظَّلَاقُ مَرْسَلٌ فَامْسَاكٌ بِمَعْرُوفٍ أَوْ تَسْرِيجٍ بِإِحْسَانٍ وَلَا يَجِدُ لَكُمْ أَنْ تَأْخُذُوهُنَّ أَتَيْتُمُوهُنَّ شَيْئًا إِلَّا أَنْ يَجِدُوا إِلَّا يُعِيشُهُمْ حُدُودُ اللَّهِ فَإِنْ خَفْتُمُ الْأَلْيَقِيمًا حُدُودَ اللَّهِ فَلَا جُنَاحَ عَلَيْهِمَا فِيهَا افْتَدَثُ بِهِ طَلْقَهَا فَلَا تَحْلُلُ لَهُ مِنْ بَعْدِ حَتْلِهِ تَعْتَدُوهُمَا وَمَنْ يَتَعَدَّ حُدُودَ اللَّهِ فَأُولَئِكَ هُمُ الظَّلَّمُونَ ﴿٢٣٤﴾ فَإِنْ طَلَقَهَا فَلَا تَحْلُلُ لَهُ مِنْ بَعْدِ حَتْلِهِ تَنْكِحَ رَوْجًا غَيْرَهُ طَلَقَهَا فَلَا جُنَاحَ عَلَيْهِمَا أَنْ يَتَرَاجَعَا إِنْ ظَنَّا أَنْ يُقِيمُهُ حُدُودَ اللَّهِ وَتِلْكَ حُدُودُ اللَّهِ يُبَيِّنُهُمَا لِقَوْمٍ يَعْلَمُونَ ﴿٢٣٥﴾ وَإِذَا طَلَقْتُمُ النِّسَاءَ فَبَلَغْنَ أَجَلَهُنَّ فَامْسِكُوهُنَّ بِمَعْرُوفٍ أَوْ سِرِّ حُوْهُنَّ بِمَعْرُوفٍ وَلَا تُمْسِكُوهُنَّ ضَرَارًا لِتَعْتَدُوهُمَا وَمَنْ يَفْعَلْ ذِلِّكَ فَقَدْ ظَلَمَ نَفْسَهُ طَوْلًا تَتَخَلَّوْا إِلَيْهِ اللَّهُ هُرْزُوا وَأَذْكُرُوهُمَا نَعْمَلَتِ اللَّهُ عَلَيْكُمْ وَمَا أَنْزَلَ عَلَيْكُمْ مِنْ الْكِتَابِ وَالْحِكْمَةِ يَعْظُمُكُمْ بِهِ وَأَنْقُوا اللَّهَ وَاعْلَمُوا أَنَّ اللَّهَ بِكُلِّ شَيْءٍ عَلِيمٌ ﴿٢٣٦﴾ وَإِذَا طَلَقْتُمُ النِّسَاءَ فَبَلَغْنَ أَجَلَهُنَّ فَلَا تَعْضُلُوهُنَّ أَنْ يَنْكِحُنَّ إِذَا تَرَاضُوا بَيْنَهُمْ بِالْمَعْرُوفِ طَلْقَهُ يُوْعَظُ بِهِ مَنْ كَانَ مِنْكُمْ يُؤْمِنُ بِاللَّهِ وَالْيَوْمِ الْآخِرِ ذِلْكُمْ أَنْ كُمْ وَأَظْهِرْ طَوْلَهُ يَعْلَمُ وَأَنْتُمْ لَا تَعْلَمُونَ ﴿٢٣٧﴾ وَالْوِدْلُتُ يُؤْضِعُنَّ أَوْلَادَهُنَّ حَوْلَيْنِ كَامِلَيْنِ لِمَنْ أَرَادَ أَنْ يُتَمَّ الرَّضَا عَةً طَوْلَهُ رِزْقُهُنَّ وَكَسْوَتِهِنَّ بِالْمَعْرُوفِ لَا تُكَفِّفُ نَفْسًا إِلَّا وُسْعَهَا لَا تُضَارَّ وَالِدَةٌ بِوَلَدِهَا وَلَا مَوْلُودَهُ بِوَلَدِهِ وَعَلَى الْوَارِثِ مِثْلُ ذِلِّكَ فَإِنْ أَرَادَ أَنْ فِصَالًا عَنْ تَرَاضٍ مِنْهُمَا وَتَشَاؤِرٍ فَلَا جُنَاحَ عَلَيْهِمَا طَوْلَهُ أَرْدَتُمْ أَنْ تَسْتَرِعُوهُمَا أَوْ لَادَكُمْ فَلَا جُنَاحَ عَلَيْكُمْ إِذَا سَلَمْتُمْ مَمَّا أَتَيْتُمْ بِالْمَعْرُوفِ وَأَنْقُوا اللَّهَ وَاعْلَمُوا أَنَّ اللَّهَ يَعْلَمُ مَا تَعْمَلُونَ بَصِيرٌ ﴿٢٣٨﴾

عزیزانِ من! آج جون 1969ء کی 8 تاریخ ہے اور ہم قرآن کریم کے درس کے سلسلہ نو میں سورۃ البقرۃ کی پچھلی

آیت 227 تک پہنچ گئے تھے، 228 سے آج آغازِ کلام ہو گا۔

نوع انسانی کے لیے اصول و اقدار کے سلسلہ میں قرآن حکیم کی نوعیت اور ان کی خصوصیت: جیسا کہ میں نے پہچلی دفعہ عرض کیا تھا قرآن کریم میں عام طور پر زندگی کے اصول اور اصولی قوانین دیے ہیں۔ اس لیے کہ جس کتاب کو زمان اور مکان کی حدود سے ماوراء نہ تھا لیعنی قیامت تک کے لیے تمام نوع انسانی کے لیے ضابطہ حیات بننا تھا، اسے ایسا ہی ہونا چاہیے تھا کہ وہ ابدی اصول اور اقدار اپنے ہاں واضح طور پر دے دیتی کہ اصول اور اقدار میں تبدلی نہیں ہوا کرتی اور ان کی روشنی میں جزوی احکام کا لقین اس ملت کی صوابید پر چھوڑتی کہ وہ اپنے اپنے دور کے تقاضوں کے مطابق خود جزئیات بھی وضع کرے اور ان پر عمل پیرا ہونے کا طریق کا رجھی متعین کرے۔ جزوی قوانین قرآن کریم نے بہت تھوڑے سے معاملات میں دیے ہیں اور وہ بھی بیشتر انسان کی عائلی زندگی Family Life کے متعلق ہیں۔ اس لیے کہ عائلی زندگی مثلاً ماں باپ کے رشتے، بہن بھائیوں کے تعلقات اور بالخصوص میاں بیوی کے تعلقات، اولاد کے ساتھ تعلقات وہ چیزیں ہیں جن میں کہ یہ تعلقات مستقل ہوتے ہیں، ان میں تبدلی نہیں آتی۔ قرآن کریم میں بیشتر احکام انہی رشتہوں کے متعلق دیے ہیں۔ عائلی زندگی کے متعلق دیے ہیں۔

### ازدواجی تعلقات کی اہمیت اور اس کے لیے دیے گئے احکام:

اس سلسلے میں سب سے پہلے اس نے میاں بیوی کے تعلقات کو لیا ہے کہ ان کے تعلقات کی خوشنگواری پر گھر کی فضا کا خوشنگوار ہونا موقوف ہے۔ گھر کی فضا خوشنگوار ہوتی ہے تو اولاد کی تربیت صحیح ہوتی ہے اور جب یہ ایک یونٹ اپنے ہاں قرآن کے الفاظ میں جنت کی سی زندگی کا ایک نقشہ مرتب کر لیتا ہے تو پھر گروہوں کی دیواریں جب گراتے چلے جائیں تو معاشرہ خود بخود جنت کی فضاوں جھولے جھولتا ہے۔ اس لیے اس نے میاں بیوی کی زندگی کے متعلق قوانین بڑی ہی تفصیل سے عطا کیے ہیں۔ پہلے چیز آئی تھی کہ نکاح کے لیے بنیادی شرط ہم آئنکی فکر و نظر ہے اور اس کے بعد یہ کہا تھا کہ یہ کوئی ایسی چیز نہیں ہے کہ ایک بندھن ہے جو ایک دفعہ باندھ دیا گیا تو خواہ اس کے بعد حالات کیسے ہی کیوں نہ پیدا ہو جائیں اس سے آزادی نہیں ہو سکتی۔ اس نے یہ بتایا ہے کہ اگر حالات ناخوشنگوار ہو جائیں اور نباه کی کوئی صورت باقی نہ رہے تو یہ جو تم نے باہمی نباه کا معاہدہ کیا تھا یہ ٹوٹ بھی سکتا ہے لیکن وہ توڑتا بھی بڑے ہی حسین کارانہ انداز سے ہے اور یہی چیز ہے جس کے لیے اس نے جزوی قوانین دیے۔ پہچلی آیت میں یہ تھا کہ پہلے کوشش کرو کہ نباه کی صورت ہو اور اگر تم نے طلاق کا ارادہ کر لیا ہے تو پھر اس کے لیے ہم نے قاعدہ مقرر کیا ہے اس کے مطابق پھر طلاق ہو جائے گی۔ طلاق کے بارے میں، میں نے عرض کیا تھا کہ اس کے لفظی معنی آزاد ہو جانے کے ہیں اور اس سے مفہوم ہے کہ یہ جواز دو اجی زندگی بس کرنے کا معاہدہ کیا تھا اس معاہدہ کی تفسیخ کا نام طلاق ہے یعنی اس کے ٹوٹ جانے کا، علیحدہ ہو جانے کا، کا لعدم ہو جانے کا نام ہے۔ اسے غور سے سن رکھیے کہ یہ بڑی اہم چیز ہے۔ آپ کہیں گے کہ یہاں چیز کیا ہے؟ ٹھیک ہے طلاق کے معنی ہیں ”آزاد ہو جانا“، تو پھر اس میں بات کون سی ہوئی؟ ابھی بات

سامنے آ جاتی ہے کہ میں کیوں زور دے رہا ہوں۔ اس کے معنی ہیں ”اس معاہدے کا ختم ہو جانا“۔ طلاق اس وقت کہیں گے جب یہ معاہدہ ختم ہو جائے گا۔ اس کے معنی ہی ”آزاد ہو جانا“ ہیں۔ جس طرح عقد کے معنی ہیں ”معاہدے کا طے پا جانا“ معاہدے کے الفاظ دہرا دینے سے یہ عقد نہیں ہو گا بلکہ یہ معاہدہ طے پائے گا تو اس وقت اسے آپ عقد کہیں گے۔ اسی طرح اس عقد کے کھل جانے کا نام آزاد ہو جانا، کالعدم قرار پا جانا، منسوخ ہو جانا، جب یہ واقع ہو جائے گا تو پھر اس کو طلاق کہا جائے گا۔ آپ ذہن میں یہ رکھیے گا۔

### طلاق کی صورت میں دیئے گئے متعین اصول و اقدار

طلاق یافتہ عورت کے بارے میں کہا ہے کہ **وَالْمُظْلَقُتْ يَتَرَبَّصُ بِأَنْفُسِهِنَّ ثَلَاثَةَ قُرُوَءٍ وَلَا يَجِدُ لَهُنَّ أَنْ يَكْتُمُنَ مَا خَلَقَ اللَّهُ فِي أَرْحَامِهِنَّ إِنْ كُنَّ يُؤْمِنْ بِاللَّهِ وَالْيَوْمِ الْآخِرِ** ① (2:228) طلاق کے بعد عورت ایک متعین مدت تک دوسرا جگہ نکاح نہیں کر سکتی۔ اس کے اندر بہت بڑی مصلحت ہے اور مصلحت خود بتادی کہ انہیں چاہیے کہ اگر وہ حمل سے ہیں تو اس کا اعلان کر دیں۔ اس کی مدت تین قروءے ہے۔ قریبی کی مدت کو کہتے ہیں یعنی ایک مہینہ عام طور پر، ایک ماہواری ایام کے بعد دوسرا مہواری ایام کا جو درمیانی عرصہ ہے، اسے کہتے ہیں اس کو تین حیض کہہ لیجیے اور یہ اس لیے ہے کہ یقین طور پر معلوم ہو جائے کہ سابقہ خاوند کا حمل اس عورت سے نہیں ہے۔ کیونکہ وہ جو ہونے والا بچہ ہے اس کے حقوق کا تحفظ نہایت ضروری ہے۔ یہ متعین ہو جائے کہ وہ کس باپ کا بیٹا ہے۔ اسی لیے یہ کہا کہ وہ اتنا انتظار بھی کرے اور اگر استقر ار حمل ہے تو اسے چاہیے کہ اسے چھپائے نہیں بلکہ بات واضح طور پر کہہ دے۔ یہاں یہ کہا کہ تین مہینے کے لیے اسے انتظار کرنا ہو گا۔ اس کو عدت کی مدت کہتے ہیں۔ جیسا میں نے پچھلی دفعہ ② کیا تھا کہ طلاق کی بات آئی تھی تو قرآن کریم کی طلاق کی تمام آیات آپ کو حوالوں سے لکھا دی تھیں کیونکہ قرآن ایک بات کو ایک جگہ بیان نہیں کرتا، متعدد مقامات میں پھیر پھیر کر لاتا ہے۔ وہ سارے مقامات بیک وقت سامنے آ جائیں تو وہ مسئلہ بالکل واضح صاف میں ہو جاتا ہے۔ عدت کے لیے بھی یہ آیات دیکھ لیجیے۔ جیسا کہ میں نے عرض کیا تھا یہ میری چھوٹی سی کتاب ہے ”قرآنی قوانین“، اس میں وہ قرآن کریم کے جو تمام قوانین ہیں وہ دیے ہوئے ہیں۔ میں وہیں سے یہ چیز آپ کے سامنے پیش کرتا ہوں۔ جیسا کہ میں نے ابھی عرض کیا کہ یہ (2:228) میں کہا گیا ہے کہ اس کے لیے یہ عدت تین قروءے ہے اور اسی لیے مسئلہ یہی ہے کہ جب وہ حیض سے فارغ ہو تو اس

① طلاق یافتہ عورت کے لئے ضروری ہے کہ وہ اپنے آپ کو (کاچ ثانی سے) اتنا عرصہ روکے رکھیں، جتنے میں ان کے تین حیض پورے ہوں۔ {جنہیں کسی وجہ سے حیض نہ آتا ہو ان کی عدت تین ماہ کی ہے (4:65) اور جس عورت کی طلاق، مقاربت سے پہلے ہو جائے، اس کی کوئی عدت نہیں (33:49)}۔ اگر وہ حاملہ ہوں تو انہیں اس امر کا اظہار کرو بنا چاہیے۔ ان کے لئے یہ قطعاً جائز نہیں کہ اللہ نے جو کچھ ان کے رحم میں پیدا کر دیا ہے وہ اسے چھپائے رکھیں۔ خدا کے قانون (اللہ اور آخرت) کو مان لینے کے بعد اس قسم کی جزئیات تک کی پابندی بھی ضروری ہو جاتی ہے۔ [حمل کی صورت میں ان کی عدت واضح حمل تک ہو گی (4:65)]۔ (پرویز: غہم القرآن، ص: 86-87)

② اس کے لئے دیکھیے مطالب القرآن فی دروس الفرقان، سورۃ البقرہ جلد سوم کا چھپایا یساں باب

وقت جو طلاق ہے وہ متعین کی جائے تاکہ عدت کے دن گنے میں آسانی رہے۔ اگر عورت ایسے مقام پر پہنچ چکی ہے، سن رسیدہ ہو چکی ہے کہ وہ حیض سے نا امید ہے یا کسی بیماری کی وجہ سے حیض نہیں آ سکا، ایسی بھی تصویر تین ہوتی ہیں کہ وہ سن رسیدہ بھی نہیں ہوتیں لیکن حیض کی بندش ہو جاتی ہے۔ اگر ایسی صورت ہو تو ان کی عدت تین مہینے کی ہے (4:65) حاملہ عورت کی عدت وضع حمل تک ہے، تین مہینے نہیں ہے۔ پہچ کی پیدائش تک ہے (4:65)۔ نکاح کے بعد اگر جس عورت کو ہاتھ نہ لگا یا جائے اور اس سے پہلے ہی طلاق واقع ہو جائے تو اس کے لیے کوئی عدت نہیں ہے (49:33)۔ بیوہ عورت کی عدت چار مہینے اور دو سو دن ہے (2:234)۔ قرآن نے بیوہ کے متعلق تشریع نہیں کی کہ اگر وہ حاملہ ہو تو کتنی عدت ہے لیکن مطلاقہ کے متعلق جو قرآن نے وضع حمل تک کہا ہے تو وہاں سے یہ مستبط کیا جاسکتا ہے کہ بیوہ حاملہ ہو تو اس کی عدت بھی وضع حمل تک ہونی چاہیے۔ عدت کے دوران مطلاقہ عورت کے رہنے سہنے کا خورد و نوش کی ذمہ داری، سابقہ خاوند کے اور پر ہوگی اور اس کا معیار وہ ہو گا جو اس سے پہلے ان کی ازدواجی زندگی میں تھا، (1:241)، (2:241)، (65:1)، (65:6-7)۔ اسے اس گھر سے نہیں نکالنا چاہیے۔ عورت کے متعلق بھی یہ کہا ہے کہ اسے وہیں رہنا چاہیے لیکن اگر حالات ساز گارنے رہیں، باہمی مناقشت ہو جائے، تنازع ہو جائے تو پھر کوئی بندش نہیں ہے، وہ دوسری جگہ بھی جاسکتی ہے۔ عورت کی طرف سے اختلاف، شفاق یا تنازع کی صورت میں وہی شکل قرآن نے تجویز کی ہے جو مرد کی صورت میں تجویز کی ہوئی ہے۔ بیوہ کے لیے ایک سال کی خورد و نوش رہائش وغیرہ کا انتظام مرد کے ذمے ہے۔ اگر وہ اس سے پہلے کہیں دوسری جگہ چلی جاتی ہے تو پھر وہ ذمہ داری ختم ہو جاتی ہے (2:240)۔

### قرآن حکیم نے بیوہ ہونے کی صورت میں اسے اسی گھر میں

رہنے کو سہولت کے طور پر بیان کیا ہے:

یہ جو کہتے ہیں کہ خاوند کے مرنے کے بعد یہ بیوہ، جس گھر میں، جس کو مژھڑی میں، جس مکان میں ہے، وہ چار مہینے دس دن تک وہاں سے نکل ہی نہیں سکتی یہ غلط ہے۔ سوال پابند مسکن ہونے کا نہیں ہے۔ یہ تو قرآن نے سزا کے طور پر تجویز کیا ہوا ہے، سورۃ النساء میں ہم دیکھیں گے تو اس بیچاری کو سزا نہیں ملتی۔ کہا تو یہ تھا کہ اس کو اس گھر سے نکالنا جائے، وہ بھی اس گھر سے نہ نکلے، وہیں رہے۔ اس کے ساتھ پہچ ہیں، وہ خود ہے تو اس صورت میں وہاں وہ جہاں رہ رہی ہے بشر طیکہ وہاں کی فضاسازگار ہو، فضاسازگارنے ہونے کی صورت میں اور بات ہے لیکن وہ یہ چیز نہیں ہے کہ اس کو یہ سزا ملی ہوئی ہے کہ وہ اتنے دن گھر سے باہر قدم نہ رکھے۔ ہمارے ہاں تو یہ رواج ہے کہ وہ کسی ضرورت کے لیے بھی گھر سے باہر قدم نہیں رکھ سکتی، جس گھر میں بھی اس کے خاوند کا انتقال ہوا ہے۔ قرآن کریم کا یہ منشا نہیں ہے۔ یہ عدت کے متعلق قرآن نے کہا وَبِعُولَتِهِنَّ أَحَقُّ بِرَدَهِنَ فِي ذِلْكَ إِنَّ آرَادُوا إِصْلَاحًا (2:228) اس دوران میں ابھی بات آئے گی کہ کون سا عدت کا یہ وقت تھا، یہ جو وقت ہے، جس میں اس نے ابھی دوسری جگہ نکاح نہیں کیا، اگر خاوند نے اس کو چھوڑا تھا، طلاق دی تھی تو اس کے لیے یہ چیز کوئی ممانعت کی نہیں ہے کہ وہ

دوبارہ بھی آپس میں نکاح کر سکتے ہیں اس کا حق فالٰق ہے۔ اگر یہ چاہے اور بڑی شرط یہ ہے کہ عورت کی بھی رضا مندی ہو۔

**کوئی مرد کسی عورت کا زبردستی مالک نہیں بن سکتا**

### نیز حقوق اور ذمہ دار یوں کا تعلق:

یاد رکھیے! عورت کی رضا مندی کے بغیر کسی صورت میں نکاح ہو ہی نہیں سکتا۔ قرآن نے کہا ہے کہ یہ حلال ہی نہیں ہے کہ تم کسی عورت کے وارث بن جاؤ کہ اسے کراہت ہو اور تم اس کے مالک بن جاؤ۔ باہمی رضا مندی سے ہی یہ معاملہ قرار پاتا ہے اور دیکھیے درمیان میں قرآن چار لفظ لایا ہے۔

عزیزانِ من! کہتے ہیں کہ صاحب! اسلام نے عورت کو حقوق دیے۔ حقوق کے بعد جب ہم ان مسائل پر جاتے ہیں جو زندگی میں بڑھتے جاتے ہیں تو وہاں نظر آتا ہے تو پہلی چیز یہ ہے کہ مردوں کو حاکم بنایا ہے عورتوں کے اوپر۔ تواب بتائیے کہ اس کے بعد مکوم کے حقوق کیا ہوتے ہیں؟ پھر حقوق کی فہرست مرتب کی جائے۔ قرآنِ کریم کے چار الفاظ ہیں، برادرانِ عزیز! اور جہاں تک میری نگاہ گئی ہے، کہیں اس قسم کے الفاظ نہ مجھے دیگر مذاہب کی مبینہ مذہبی کتابوں میں ملے ہیں، نہ کسی اور جگہ جو قرآن نے کہا ہے کہ وَلَهُمَّ مِثْلُ الذِّي عَلَيْهِنَّ بِالْمَعْرُوفِ (۲:۲۲۸) چار الفاظ میں لکھی جامعیت سے بات کہہ گیا ہے کہ یاد رکھو! جو ذمہ داری عورت پر عائد ہوگی ایک ذمہ داری کے مقابلے میں اس کا ایک حق ثابت (Establish) ہو جائے گا۔ ہر Responsibility کے مقابلے میں، ہر Acrue Right کے مقابلے میں، ایک کیا بات ہے صاحب! یہ ہے عالمی زندگی میں خدا عدل کا ترازو لیے ہوئے بیٹھا ہوا۔ جتنی ذمہ داریاں عائد کرو، اس کو اتنے حقوق دینے ہوں گے۔ یہ ہے حقوق اور ذمہ دار یوں کا تعلق یہاں ذمہ داریاں ساری کی ساری عورت کی ہیں، حقوق سارے کے سارے مرد کے ہیں، یہ حاکم واقع ہوئے ہیں۔ پھر وہ آگے بڑھتے ہیں تو روایات آتی ہیں کہ اگر کسی کو سجدہ کرنے کی اجازت ہوتی تو میں یہ کہتا کہ عورت مرد کو سجدہ کرے۔ پھر مرد یعنی خاوند عورت کا مجازی خدا تو ہے ہی۔ پھر یہ میاں ہے یعنی اس کے بعد اللہ میاں ہے اور یہ میاں ہے۔ تو اس کے بعد حقوق تصوہر نہیں ہو سکتا۔

**چار چار شاد یوں کے سلسلہ میں قرآن حکیم کی شرط کا تذکرہ نہ کرنا،**

**قرآن کے خلاف ایک عجیب جسارت ہے**

عزیزانِ من! حقوق کا تصور تو ان چار لفظوں ① میں ہو گا صاحب! ہر ذمہ داری کے مقابلے میں ایک حق ہے۔ کیجیے فہرستیں مرتب لیکن ہمارے ہاں تو ہوتا یہ ہے، عجیب چیز ہے، قرآن کے ساتھ جو کیا جاتا ہے، قرآن کی آیت کے ایک لکڑے کو یہ اس طرف اشارا ہے کہ وَلَهُمَّ مِثْلُ الذِّي عَلَيْهِنَّ بِالْمَعْرُوفِ وَلِلَّٰهِ جَاءٌ عَلَيْهِنَّ ذَرَجَةٌ (۲:۲۲۸) قانونِ خداوندی کی رُوئے مرد اور عورت کے حقوق و فرائض یکساں ہیں (پرو یز: مفہوم القرآن، ص: 87)

الگ کر لیا جاتا ہے۔ وہ جو آپ کو ایک آیت تین تین چار چار بیویاں کرنے کے سلسلے میں سنایا کرتے ہیں۔ آپ دیکھیں گے کہ آیت بھی یہاں سے پڑھی جاتی ہے، نکاح نامے کے جو فارم چھپے ہوئے ہوتے ہیں، ان پر میں نے دیکھا ہے کہ آیت یہاں سے لکھی جاتی ہے۔ کہاں سے لکھی جاتی ہے؟ یہاں سے کہ فَإِنْكُحُوا مَا طَابَ لَكُمْ مِّنَ النِّسَاءِ مَثْلُثٍ وَ ثُلَثَةٍ وَرُبَاعَ (4:3) عورتوں میں سے جو تمہیں پسند ہیں دو دو تین تین چار چار شادی کرو۔ نکاح کے وقت یہاں سے یہ آیت پڑھی جاتی ہے، نکاح نامے کے اوپر یہاں سے یہ آیت لکھی ہوئی ہوتی ہے۔ تھوڑی سی عربی جانے والا بھی یہ جانتا ہے کہ یہ جو فَإِنْكُحُوا میں ف ہے اس کے معنی ”تو“ ہے تو اس سے پہلے اگر ہو گا یعنی شرط پہلے ہو گی تو اس کے بعد جزا ہو گی فَإِنْكُحُوا کے معنی ہیں تو تم ایسا کرو۔ کیا کبھی کوئی فقرہ ایسا شروع ہوتا ہے جو ”تو“ سے شروع ہو اور پہلے اس کے اگر نہ ہو؟ لیکن یہ یہاں سے یہ آیت شروع کرتے ہیں یہ ابتدائیں ہیں ہے یہ آیت کا درمیان ہے، یہ اس سے پہلے شرط موجود ہے کہ وَإِنْ خَفْتُمْ (4:3) اور اگر یہ دیکھئے پہلے اگر آیا۔ جملہ سوچنے تو بتا ہی اس طرح سے ہے کہ شرط پہلے ہوتی ہے جزا اس کے بعد ہوتا ہے۔ وَإِنْ خَفْتُمْ (4:3) یہ کبھی نہیں پڑھیں گے، یہ بھی نہیں لکھیں گے۔ قرآن کی آیت کے متعلق یہ کچھ آپ کے ہاں ہوتا ہے دھڑلے سے ہوتا ہے، ۃ محفلوں میں ہوتا ہے، لکھا ہوا ہوتا ہے۔ وَإِنْ خَفْتُمْ الَّا تُقْسِطُوا فِي الْيَتَمِي فَإِنْكُحُوا مَا طَابَ لَكُمْ (4:3) اگر تمہیں اس چیز کا ڈر ہو کہ وہ جو عورتیں خاوند کے بغیر رہ گئی ہیں، حالات ایسے پیدا ہو گئے ہیں کہ بیوائیں اتنی رہ گئی ہیں یا ان کے بچے ہیں کہ جن کا معاملہ تم کسی طرح سے بھی حل نہیں کر سکتے اور انصاف سے طے نہیں کر سکتے تو پھر اس کی ایک شکل یہ ہے کہ ان کی حفاظت کے لیے ان کو نکاح میں لا کر ان کی حفاظت کا سامان کر دو اور پھر آگے اگلی شرط یہ چیز ہے کہ فَإِنْ خَفْتُمْ الَّا تَعْدِلُوا فَوَاحِدَةً (4:3) اور اس پر اگر تم دیکھو کہ عدل نہیں کر سکو گے تو پھر وہ وہی ایک والاقانون رہے گا۔

### دوسری شادی کے سلسلہ میں حالات کے تقاضوں کو پیش نظر رکھنا ضروری ہوتا ہے

قرآن ہے عزیزان! اس عمدگی سے کہہ گیا کہ قانون تو ایک ہی کا ہے لیکن اگر کبھی ایسے حالات پیدا ہو گئے ہنگامی معاشرے میں جیسے کہ جنگ کی صورت میں پیدا ہوتے ہیں اور پھر اسلامی سوسائٹی کے اندر یہ صورت واقعی خطرناک شکل اختیار کر جاتی ہے کہ مسلمان عورت کسی غیر مسلم سے شادی ہی نہیں کر سکتی، نہ کافر سے نہ مشرک سے، نہ اہل کتاب سے۔ مختصر سی ایک جماعت مدینے میں ہے جنگ شروع ہو جائے جنگ میں جنون جوان ہیں وہ کام آتے ہیں۔ وہ جنگ میں کام آنے شروع ہو گئے، مردکم ہو گئے، عورتیں زیادہ ہو گئیں۔ مکے سے مسلمان عورتیں اپنے کافر شوہروں کو چھوڑ کر بھاگ کر مدنیے آگئیں۔ یہ کمیوٹی کے مردوں کی تعداد کم ہو رہی ہے، عورتوں کی تعداد اتنی بڑھ رہی ہے۔ اس کے لیے ایک ہنگامی صورت پیدا کی تھی کہ اگر تمہیں یہ خطرہ لاحق ہو جائے کہ ان کے مسئلہ کا کوئی معقول اور مناسب حل نہ ملتا ایک سے زیادہ چار تک شادیاں کر سکتے ہیں لیکن اگر (تم ان سے عدل نہیں کر سکو گے) تو پھر صرف ایک

شادی کا ہی قانون ہوگا۔ یہ ہیں قرآن کے الفاظ۔ کتنا عجیب جامع لفظ ہے۔ عورت کے ساتھ Justice (انصاف) میں آپ سمجھ سکتے ہیں کہ کیا کچھ شامل ہے۔ اس صورت میں اگر معاشرہ چاہے تو اس مشکل کا یہ ایک حل ہے لیکن اس میں بھی یہ دیکھا لو کہ گھر کو جہنم نہ بنالو تَعْدِلُوا (4:3) کے معنی یہی نہیں ہیں کہ آنے والی بیوی سے تم عدل نہیں کر سکو۔ جو پہلے رہنے والی ہے اس سے عدل نہیں ہوا تو وہ کیا کرے گی صاحب؟ اس سے تو عدل اسی صورت میں ہوگا کہ اس کی رضامندی سے ایسا ہو ورنہ پہلے دن سے ہی غیر عدل کی شکل پیدا ہو جائے گی لیکن میں جب سورۃ نس آعپ آؤں گا۔ وہاں عرض کروں گا۔ میں یہ کہہ رہا تھا کہ ہمارے کرتے یہ ہیں کہ قرآن کی آیتوں کے اندر سے چار لفظ ٹکڑے لے کر کہ دیکھیے صاحب! قرآن نے یہ کہہ دیا ہے۔

### عورتوں پر مردوں کی فضیلت کی وضاحت اور نوعیت

اسی طرح سے یہاں ہوتا ہے کہ واہ صاحب! آپ نے کہہ دیا کہ یہاں مساوات ہے، حقوق اور ذمہ داریاں برابر ہیں!! یعنی آپ نے کہہ دیا گویا یہ جو چار الفاظ تھے یہ تو قرآن میں، میں نے داخل کیے تھے اور اگلے چار لفظ ان کے قرآن میں تھے، وہاں سے بات آگئی۔ **وَلِلَّٰهِ جَاءٌ عَلَيْهِنَّ دَرَجَةٌ** (2:228) دیکھو صاحب! قرآن کہتا ہے مردوں کو ان کے اوپر فضیلت حاصل ہے، افضلیت حاصل ہے، درجات حاصل ہیں۔ ساری آیت پڑھو تو بات ثابت ہو جائے۔ وہ کہتا ہے طلاق کی صورت میں فریقین اس معاملہ سے آزاد ہو گئے۔

اب یہاں عورت پر ایک پابندی عائد کی جا رہی ہے کہ وہ تین ① میںیں تک نکاح نہیں کر سکتی۔ اس پابندی کی مصلحت بتائی جاتی ہے۔ مرد کے لیے تو یہ چیز ضروری نہیں ہے جس کے لیے یہ چار میںیں تک نہیں ہے۔ وہ تو اس لیے تھا کہ اس کا فریقین ہو جائے کہ حمل نہیں ہے۔ مرد کی صورت میں تو ضرورت نہیں تھی اس لیے مرد پر یہ عدت کی پابندی لگائی نہیں گئی۔ کہا یہ کہ عورت کے اوپر یہ پابندی ہے ان کی ذمہ داریاں اور حقوق بالکل یکساں ہیں۔ بس یہ ایک معاملہ ہے جس میں مرد کو یہ Advantageous Position (سودمند حیثیت) حاصل ہے۔ **دَرَجَةٌ** ایک معاملہ ورنہ کہا جاتا ہے کہ صاحب! اگر یہ صورت ہے تو پھر اس پر بھی عدت لگائیے۔ یہاں آیت آئی ہے کہ **وَلِلَّٰهِ جَاءٌ عَلَيْهِنَّ دَرَجَةٌ** (2:228) اس معاملے ایک ایسی چیز ہے جسے تم کہہ سکتے ہو کہ مرد کو کچھ Advantageous Poisiton (سودمند حیثیت) حاصل ہو گئی عورت کے معاملے میں۔ جہاں یہ ہو رہی ہے وہاں بھی قرآن بتا رہے کہ **دَرَجَةٌ** یہ ایک درجہ، ایک چیز ہے، جس کے اندر قرآن نے اس کو یہ فضیلت دی ہے Advantageous Position (سودمند حیثیت) دی ہے۔ ورنہ اصول یہی ہے **وَلَهُنَّ مِثْلُ الدِّينِ**

① طلاق یا نتیع عورت کے لئے ضروری ہے کہ وہ اپنے آپ کو (نکاح ثانی سے) اتنا عرصہ روکے رکھیں، جتنے میں ان کے تین حیض پورے ہوں (جنہیں کسی وجہ سے حیض نہ آتا ہو ان کی عدت تین ماہ کی ہے) اور جس عورت کی طلاق مقاربت سے پہلے ہو جائے، اس کی کوئی عدت نہیں (33:49)۔ اگر وہ جملہ ہوں تو انہیں اس امر کا اٹھا رکھنا چاہیے۔ ان کے لئے یہ قطعاً جائز نہیں کہ اللہ نے جو کچھ ان کے رحم میں پیدا کر دیا ہے وہ اسے چھپائے رکھیں۔ خدا کے قانون (اللہ اور آخرت) کو مان لینے کے بعد اس قسم کی بجز نیات تک کی پابندی بھی ضروری ہو جاتی ہے۔ (حمل کی صورت میں ان کی عدت وضع حمل تک ہو گی) (4:65)۔ (2:228)۔ (پرویز: مفہوم القرآن، ص: 87)

**عَلَيْهِنَّ بِالْمَعْرُوفِ ۚ** ① (2:228) قرآن کی رو سے قاعدے قانون حقوق اور ذمہ داریاں یکساں ہوں گی۔ بس ایک ایسی چیز ہے کیونکہ عدت کا بیان آ رہا تھا نا، مرد کے لیے عدت بھی نہیں ہے، خیال پیدا ہو سکتا تھا کہ اللہ میاں رعنی کر گیا۔ کیونکہ ”اللہ میاں دے متعلق وہی تے تصور کچھ ایسا ای اوندا اے کہ یعنی اے عورت تے نئیں ذہن اچ او ندا مردا ی ذہن اچ او ندا ہیگا“ ② - حالانکہ اسی لیے اس نے کہا ہے کہ کہیں ہماری بیٹیوں کے ذہن میں یہ نہ آ جائے کہ لئے یلدن ۴ وَأَنْهُ يُؤْلَدُ ۵ (3:112) کہہ دیا تھا کہ تم اس فرض کی کوئی چیز ذہن میں نہ رکھنا۔ یہ تذکرہ تانیت کا سوال ہی وہاں پیدا نہیں ہوتا لیکن پھر بھی آپ دیکھتے ہیں مردوں کا دیا ہوا جو تصور ہے آپ دیکھتے ہیں کہ جب بھی خدا کا ذکر آتا ہے اس کے لیے مذکور کے صبغ استعمال ہوتے ہیں۔ تو اس نے وہیں یہ چیز کہہ دی کہ ایسی بات نہیں ہے بس یہ ایک معاملہ ہے کہ اس کے لیے عدت نہیں ہے۔ وہ تم سمجھتے ہو کہ تمہیں اس کے لیے ہم نے نہیں رکھا ”کچھ رعنی کرن والی گل نئی ہیگی“ ③ بس وہاں اس کی ضرورت نہیں تھی۔ یہ ہے وَلِلَّهِ جَاءِ عَلَيْهِنَّ دَرَجَةٌ ۖ وَاللَّهُ عَزِيزٌ حَكِيمٌ ۝ (2:228) پابندیاں عائد کرنے اور اس کے ساتھ ہی یہ کہ حکمت پر پابندیاں ہیں جو عائد کر رہا ہے۔

### قرآن حکیم کی روشنی میں طلاق کا طریق کار:

میں نے پچھلی دفعہ عرض کیا تھا کہ طلاق کے متعلق جو حوالے اور قوانین ہیں میں نے عرض کر دیے تھے۔ اب وہی آتیں ہیں کہ **الْطَّلاقُ مَرْتَبَةٌ فِيمَسَاكٍ بِمَعْرُوفٍ أَوْ تَسْرِيجٍ بِإِحْسَانٍ** ۶ (2:22) یہ ترجمہ ہے کہ دو مرتبہ کی طلاق ایسی ہے کہ جس کے بعد قاعدوں کے مطابق روکا جاسکتا ہے، نکاح میں رکھا جاسکتا ہے، حسن سلوک سے آزاد کیا جاسکتا ہے۔ بات آسان ہے۔ طلاق: طلاق کے معنی آپ نے سمجھ لیے کہ یہ جو عقد نکاح ہے، اس سے آزادی حاصل ہو جانا، اس کا فست ہو جانا، اس کا کالعدم ہو جانا، عورت و مرد کا اس عقد سے آزاد ہو جانا۔ میں نے پچھلی دفعہ تفصیل سے یہ سمجھایا تھا کہ بات کیا تھی؟ طلاق کے لیے ایک قاعدہ مقرر ہے، پروپریتی کے ہاں سے حکم مقرر ہوں گے۔ وہ آپس میں بیٹھیں گے ایک

① عورتوں کے لئے ازروئے معروف، ان ذمہ داریوں کے مطابق حقوق ہیں جو ان پر عائد ہوتی ہیں۔ یعنی جس طرح مردوں کے حقوق عورتوں پر بھی اسی طرح عورتوں کے حقوق مردوں پر ہیں۔ لمحاظ حقوق و فرائض ان میں کسی کو کسی پر فضیلت نہیں۔ دونوں مساوی ہیں لیکن اس کے بعد ہے کہ وَلِلَّهِ جَاءِ عَلَيْهِنَّ دَرَجَةً (2:228) مردوں کو ایک بات میں ان پر فوقيت حاصل ہے۔ وہ ایک بات کیا ہے؟ اس کا ذکر خود اس آیت میں موجود ہے۔ طلاق کے بعد عورت کے لئے عدت کی معیاد مقرر ہے جس میں وہ کسی سے نکاح نہیں کر سکتی لیکن مرد کے لئے عدت کی کوئی قید نہیں۔ یہ نہیں کہ مرد (Men) عورتوں (Women) کے مقابلہ میں افضل (Superior) ہیں۔ آپ تاریخ انسانیت پر غور فرمائیے۔ عورتوں اور مردوں کے سلسلہ میں ہر جگہ ”عَلَيْهِنَّ“ نہیاں طور پر دکھائی دے گا یعنی مردوں کے حقوق ہی حقوق ہوں گے اور عورتوں کی ذمہ داریاں ہی ذمہ داریاں۔ عورت کا کوئی حق نہیں تسلیم کیا جائے گا۔ یعنی عورت کسی بات کو مرد سے بطور استحقاق (As of Right) طلب نہیں کر سکے گی۔ یہ انقلاب آفرین آواز آپ کو قرآن کی عدالت سے بلند ہوتی ستائی دے گی کہ عورت کے بھی اسی طرح حقوق ہیں جس طرح مرد کے۔ اور اس بات میں دونوں برابر ہیں۔ جس قسم کے مردوں حقوق عورتوں پر (عَلَيْهِنَّ) اسی قسم کے عورتوں کے حقوق مردوں پر (لَهُنَّ)۔ (پروپریتی: لغات القرآن جلد دوم، ادارہ طلوع اسلام لاہور 1960ء ص: 644 تا 645)۔

② اللہ میاں کے متعلق بھی تو تصور ایسا ہی ہے یعنی کہ عورت ذہن میں نہیں آتا ہے۔ مرد ہی ذہن میں آتی ہے۔ ③ کچھ رعایت دینے والی بات نہیں ہے۔

ثالث ہوگا، مصالحت کی کوشش کریں گے، ناکامی کی صورت میں فیصلہ دیں گے۔ اس وقت یہ عقد کا رشتہ جو معاہدہ ہے، یہ کالعدم قرار پائے گا۔ اس وقت جب یہ کالعدم قرار پائے گا تو اسے طلاق کہا جائے گا۔ ایک دفعہ زندگی میں میاں بیوی کی یہ صورت ہوئی قرآن نے کہا پھر بھی گنجائش ہے، دوبارہ بھی میاں بیوی بن سکتے ہو۔ ٹھیک ہے۔ ایک دفعہ پھر دوبارہ ایسی صورت واقع ہو گئی، یعنی دوبارہ یہی پرسیس دہرایا گیا، دوبارہ پھر یہ جو عقد ہے، فتح ہوا، دوبارہ پھر یہ اس معاہدہ سے آزاد ہو گئے۔ یہ دو مرتبہ ہو گیا۔ کہا کہ دوسری مرتبہ بھی اس کی گنجائش رکھی گئی ہے کہ میاں بیوی ہو سکتے ہو اور اس کے ساتھ کہا کہ یہ بچوں کا حکیم نہیں ہے کتم روز بار بار یہ دہراتے چلے جاؤ اور بار بار پھر یہ بنتے چلے جاؤ۔ دو مرتبہ کی گنجائش بھی کوئی کم گنجائش نہیں، اتنی ہم نے دے دی، اس کے بعد اگر تم نے اس کو دہرایا تو پھر کوئی گنجائش نہیں تمہارے لیے۔ بات صاف ہو گئی کہ دو مرتبہ کی الطلاق میں یہ گنجائش ہے۔

### ہمارے ہاں طلاق پر عمل پیرائی کا طریق نیز ایک غلط فہمی کا ازالہ:

یہ ہے قرمان۔ ہمارے ہاں کیا چیز ہے؟ کہ صاحب! اگر ایک بار یادو بار لفظ طلاق کہہ دیا: طلاق طلاق، اس میں تو گنجائش ہے اور اگر تین دفعہ یا باری یہ لفظ کہہ دیا تو بس پھر گنجائش نہیں ہے۔ عزیزان من! قانون کی بات ہو رہی ہے۔ کیا یہ چیز ہے کہ قانون کا جو ایک لفظ ہے اگر دو دفعہ کہا جائے تو کوئی بات نہیں ہے، تین دفعہ اس لفظ کو کہہ دیا جائے، کیا یہ قانون ہو گا خدا کا بنایا ہوا قانون؟ کہ پھر گنجائش نہیں ہے۔ یہ ہیں ہمارے وہ قوانین جن کو غیر مسلم دیکھتے ہیں تو یہ کہتے ہیں کہ صاحب! یہ ہیں قوانین جنہیں آپ کہتے ہو کہ خدا نے ہمارے ہاں ابدی قوانین دیے ہوئے ہیں اور ساری دنیا کے قوانین سے وہ اعلیٰ اور افضل اور بلند مرتبہ ہیں۔ یہ ہے وہ چیز کہ دو مرتبہ ایک لفظ دہرایا جائے تو خیر کوئی بات نہیں ہے اور تین مرتبہ اگر وہی لفظ کہہ دیا جائے تو پھر وہ معاملہ ختم ہوا۔ نیلام کرنے والے کی طرح وہ تو جاتا ہے تین دفعہ۔ عزیزان من! یہ بات نہیں ہے اور عجیب چیز ہے، قرآن ہے، عزیزان من! خدا کا کلام ہے، اسے معلوم تھا کہ ہم نے کیا کرنا ہے۔ دو ہی آئینیں بعد قرآن نے یہ کہا ہے کہ **وَلَا تَتَخَلُّوَا أَيْتِ اللَّهُ هُرُوا** (2:231) دیکھنا خدا کی ان آیات اور قوانین کو کہیں مذاق نہ بنالیں۔ کہیں کہا ہے، یہ ہیں قرآن کے الفاظ۔ دو مرتبہ کی یہ صورت ہے۔ تیسرا مرتبہ طلاق کی نوبت آجائے تو اس کے بعد وہ ایسا نہیں کر سکیں گے کہ پھر میاں بیوی کے تعلقات قائم کر لیں (4:19)۔ قرآن کریم نے کہا ہے کہ **وَلَا يَحِلُّ لَكُمْ أَنْ تَأْخُذُوا إِمَّا أَتَيْتُمُوهُنَّ شَيْئًا إِلَّا أَنْ يَخَافَا إِلَّا يُقْبِلَا حُدُودَ اللَّهِ فَإِنْ خَفْتُمُ الَّا يُقْبِلَا حُدُودَ اللَّهِ** (2:229) تم طلاق دینے لگے ہو، تو یہ غلط بات ہے کہ تم جو اس سے پیشتر، مہر کی صورت میں، عطیے کی صورت میں اور کچھ زیورات کی صورت میں، اسے دے چکے ہو تو وہ اس سے چھیننا شروع کر دؤیے غلط بات ہے لیکن اب یہ معاشرے کے لیے ہے، وہ جو ایک ثالث کمیٹی اس کے لیے بیٹھی تھی، اگر تم دیکھو کہ یہی چیز اس معاملے میں روک بن رہی ہے تم دیکھ سکتے ہو کہ میاں بیوی رہ کے جو اللہ نے حدود مقرر کیے ہیں ان پر وہ قائم نہیں رہ سکتے اور یہ کچھ لینے دینے کا معاملہ اس کے درمیان میں آڑے آ رہا ہے تو یہ چیز ایسی نہ ہو جائے کہ اس معاملے کو

حل کرنے کے راستے میں سنگ گراں بن جاؤ نہیں۔ فَإِنْ خَفْتُمُ آلَّا يُقْيِيمَا حُدُودَ اللَّهِ فَلَا جُنَاحَ عَنْهُمَا فِيهَا افْتَنَتْ بِهِ<sup>۲:۲۲۹</sup> (2:229) عورت کو یہ کچھ دیا تھا تو کہا ہے کہ اگر ایسی صورت ہو معاشرہ یہ دیکھے کہ عورت کی طرف سے طلاق کا مطالبہ ہو رہا ہے، بغیر دیے ہوئے یہ معاملہ طے نہیں ہو رہا تھا تو ٹھیک ہے تم اسے کہہ سکتے ہو کہ جو کچھ دیا تھا اس میں سے کچھ وہ واپس دے دے۔ میں نے پچھلی دفعہ عرض کیا تھا کہ اس میں کتنی بڑی حکمت پوشیدہ ہے۔ نکاح کے وقت خاوند مرکی شکل میں، مہربھی تحفہ ہوتا ہے، گفت کی شکل میں اس عورت کو دیتا ہے۔ اب اس قانون کو Abuse کیا جاسکتا ہے۔ وہ جو کہ کرنے والی ہو، آج اس نے ایک نکاح کیا، پیچاں ہزار روپیہ مہر تھا، اسے وصول کیا، نہ بھی کیا تو ہفت بھر کے بعد طلاق مل جاتی ہے۔ اس کے بعد دوسرا جگہ نکاح کیا۔ میں یہ Abuse کرنے والیوں کا کہہ رہا ہوں۔ تو قانون دینے والا جو خدا ہے، وہ ان راستوں کو بھی بند کرتا ہے۔ کہا کہ یہ صورت نہ ہو کہ کوئی یہ اس قسم کا قصہ شروع کر دے۔ ایسی صورت میں یہ مجاز ہے: ثالث، یہ حاکم، یہ عدالت، یہ فیصلی کورٹ وہ یہ طے کرے کہ نہیں کوئی چیز ایسی پیدا نہیں ہوئی ہے اور تم تو اس غرض کے لیے یہ کچھ کر رہی ہو اس لیے ٹھیک ہے وہ تمہیں واپس دینا ہوگا۔ یہی مشکل ہے جس کے لیے کہا کہ اگر تم دیکھو کہ وہ حدود اللہ کی پابندی نہیں کر سکیں گے تو اس صورت میں تم عورت سے یہ کہہ سکتے ہو کہ کچھ تم واپس دے دو، پھر معاہدہ شفخ کر دو۔

**عورت کو ناکردار گناہ کی سزا کس لیے؟ کہ کرے کوئی اور بھرے کوئی**

اب ہمارے ہاں یہ صورت ہے کہ مرد کو تو یہ حق حاصل ہے کہ جس وقت جب جی چاہے بغیر کسی قسم کا کوئی Reason دیے ہوئے کوئی وجہ بتائے، کوئی سبب بتائے، طلاق طلاق اور طلاق تین مرتبہ کہا اور معاملہ ختم ہوا۔ اس کے بعد دوبارہ ان کا نکاح، وہ جو میں نے عرض کیا تھا بار بار دہرانا اچھا نہیں لگتا، بزم میں میری بیٹیاں اور بہنیں بیٹھی ہوئی ہیں، وہ جسے آپ حالہ کہتے ہیں، ہوگا۔ مرد کو تو یہ حق حاصل ہے کہ جب جس وقت جی چاہے، ذرا ساغھصہ تاو میں آیا کہ ہندنیا میں نمک زیادہ پڑا، طلاق طلاق کہا اور معاملہ ختم کر دیا۔ اس کے بعد یہ بے گناہ بیچاری رورہی ہے۔ عورت کے اُپر ظلم پڑھا ہو رہے ہیں، اسے کوئی حق حاصل نہیں ہے کہ جو معاہدہ اس کی مرضی سے اس طرح سے طے ہوا تھا، وہ اپنی مرضی سے توڑ دئے یہ جائے عدالتوں میں۔ یعنی مرد کے لیے اگر یہ رکھا جاتا تو پھر بھی یہ بات تھی کہ روز عدالتوں میں یہ جاتے ہی ہیں۔ یہ بیچاری پر دینشین گھر میں بیٹھنے والی جس کے متعلق قرآن نے کہا ہے کہ اس کی تو حالت یہ ہے کہ یہ بیچاری اپنا Cause پlead کر سکتی۔ اسے تو یہ حکم دیا گیا ہے کہ جاؤ کچھری، میاں صاحب گھر میں کھڑے کھڑے طلاق طلاق کہا اور معاملہ ختم کر دیا اور جب پھر وہ کچھری والا معاملہ ہوتا ہے تو اس میں جو کچھ ہوتا ہے وہ آپ کو اور مجھے سب کو معلوم ہے۔ کیا خدا یہ اس قسم کے قوانین دے گا؟ جس کے متعلق خود اس نے یہ کہا ہے کہ اس کو تو مرد نے اس حالت میں رکھا ہوا ہے کہ یہ بیچاری دوسرے مرد کے سامنے اپنا قصہ بیان نہیں کر سکتی۔ بات بھی یہ ٹھیک ہے تِلْكَ حُدُودُ اللَّهِ فَلَا تَعْتَدُوهَا<sup>۲:۲۲۹</sup> (2:229) یاد رکھو! یہم نے حدیں باندھ دی ہیں، ان سے تجاوز نہ کرو۔ سینے او مَنْ يَتَعَدَّ حُدُودَ اللَّهِ فَأُولَئِكَ هُمُ الظَّالِمُونَ<sup>۲:۲۲۹</sup> (2:229) جوان

حدود سے تجاوز کریں گے، ظلم کریں گے۔ دیکھا آپ نے آج معاشرے میں عورت کے اوپر کتنا ظلم ہوتا ہے۔ یہ سب کا سب حدود اللہ سے تجاوز ہوا ہوا ہے۔

### دومرتہ طلاق ہونے کے بعد کا سوال؟

اگر میاں بیوی کی ازواجی زندگی میں دو مرتبہ کی طلاق ہو جائے اور تین مرتبہ کا نکاح ہو جکا ہو تو کہا کہ فَإِنْ طَلَقَهَا (2:230) دو دفعہ معاہدے کے فتح ہو جانے کے بعد گنجائش باقی ہے اور اگر دو کے بعد آگے پھر نوبت آگئی ہے، اگر یہ صورت پیدا ہوئی ہے تو فَلَا تَحُلُّ لَهُ مِنْ بَعْدِ حَثْنِكَحْ رَوْجَاعَيْرَدَةٍ فَإِنْ طَلَقَهَا فَلَا جُنَاحَ عَلَيْهِمَا آنِيٰ تَرَاجِعًا إِنْ طَنَّا آنِيٰ قِيمًا حَدُودُ اللَّهِ يُعِظِّمُهَا لِقَوْمٍ يَعْلَمُونَ (2:231) ہاں! اس نے کہیں کسی اور مرد سے پھر شادی کر لی، زمانہ گزر گیا، بیوی ہو گئی یا وہاں سے بھی اس کی طلاق کی نوبت آ پہنچی۔ اس دوران میں آپ کے تجربے نے بتایا کہ نہیں! یہ نکاح بہتر تھا۔ کہا کہ اب پھر اس کی گنجائش نکلی۔ ابدی طور پر وہ بالکل نہیں دھتکارتا، قانونی پابندیاں عائد کرتا ہے تاکہ اصلاح کی شکل نکلتی آئے۔ یہ تھی وہ چیز جس کے لیے کہا کہ تین دفعہ یہ طلاق کہہ دیا اور اس کے بعد پھر، (معاذ اللہ) چھوڑ دیے قصہ، آپ کو پتہ ہے، میں نہیں دھرانا چاہتا۔ وَإِذَا طَلَقْتُمُ النِّسَاءَ فَبَلَغْنَ أَجَلَهُنَّ فَأُمْسِكُوهُنَّ بِمَعْرُوفٍ (2:231) وہی دو دفعہ کی طلاق کا قصہ جس میں واپسی کی گنجائش ہے۔ اگر وہ اپنی عدت کی مدت پر پہنچانا چاہتی ہیں تو اس کے بعد پھر یہ چیز فصلے کر دینے کی ہے۔ رکھنا چاہتے ہو، قانون کے مطابق میاں بیوی رہنا چاہتے ہو، اس صورت میں میاں بیوی رہ سکو۔ حسن سلوک سے چھوڑنا چاہتے ہو تو اس کو حسن سلوک سے چھوڑ دو۔ یہاں چھوڑتے وقت بھی حسن سلوک ہے۔

### بآہمی تعلقات کے منقطع ہونے پر بھی حسن کا رانہ تعلقات کو نظر انداز نہیں کرنا

یہ تو میاں بیوی کا آپس میں چھوڑنا ہے، عزیزانِ من! وہ تو کہتا ہے کہ دشمنوں کو بھی، کسکے قریش رسول اللہ ﷺ اتنی اذیت دے رہے ہیں۔ اس کے بعد وہ وقت آ رہا ہے جب ان سے قطع علاقہ کیا جائے گا، قطع تعلق کیا جائے گا، وہاں بھی کہا گیا ہے کہ وَاهْجُرْ هُمْ هَجَرَأَ بَجِيلًا (10:73) تعلقات حسن کا رانہ رکھنے کا تور ہا ایک طرف، اس نے تو کہا ہے کہ تعلقات منقطع کر تو وہ بھی حسن کا رانہ انداز سے منقطع کرو، ورنہ تعلقات کے منقطع ہونے میں وہ تو آپ کو معلوم ہے، پنجابی میں کیا کہا گیا ہے کہ ”میری لگدی کسے نہ دیکھی تے مٹھی نوں جگ جاندا“ ① یہ ٹوٹنا ہمارے ہاں کا تو پھر ایسا تماشہ Create کرتا ہے۔ قرآن ہے عزیزانِ من! وہ تعلقات منقطع کرنے میں بھی کہتا ہے کہ بجیلًا شریف انسان کا کام یہ ہے، نہیں نجھا ہوا، تعلقات منقطع ہو رہے ہیں، شرافت کو چھوڑ کے حیوانی درجے پر کیوں آتے ہو، حسن کا رانہ انداز سے تعلقات کا انقطاع کرو۔ تو میاں بیوی کے تعلقات جو ہیں وہ حسن کا رانہ انداز سے کیوں نہیں ہوں گے۔ اُو سَرِّ حُوْهُنَّ بِمَعْرُوفٍ وَلَا تُمْسِكُوهُنَّ ضَرَارًا لِّتَعْتَدُوا (2:231) یا قاعدے کے مطابق انہیں رخصت کر دو۔ دیکھیے! یہ دوبارہ تم نے نکاح میں لانا

① جب رشتہ طے ہوا، ملاپ ہوا تو کسی کو خبر نہ ہوئی اور جب رشتہ منقطع ہوا تو اس قدر چاہ اور رسولی ہوئی کہ اسے سارے عالم جانتا ہے۔

ہے میاں بیوی کی حیثیت اختیار کرنی ہے، تو اس نیت سے نہ کرو کہ ان پر زیادتی کر کے انہیں تکلیف پہنچائی جائے اور کہو کہ اپھا ایک دفعہ تو نکل آؤں اب کے آ! ”فیر تینوں سٹ لال گا ①“ کہتا ہے اس نیت سے دوبارہ نکاح نہ کرو ان عورتوں سے۔

### لفظ زوج کا قرآنی مفہوم

میاں بیوی اور ان کے تعلقات کی بنیاد اس حسن کا رانہ انداز کے اُپر ہو۔ کہتا ہے تم سمجھ کیا رہے ہو! یہ تعلقات ہی ”زوج“ کے ہیں اور میں آپ کو بتا پڑھا ہوں کہ زوج کہتے ہی ان دو چیزوں کو ہیں کہ ”دونوں کے ملنے سے ایک اکٹھی چیز بنے“، ان میں سے اگر ایک رہ جائے یا ایک ناقص ہو جائے کہ بات آگے ہی نہ چلے۔ گاڑی کے جو دو پیسے ہوتے ہیں، وہ ایک دوسرے کے زوج کہلاتے ہیں۔ اتنا ان کا صحیح، برابر کا ہونا ضروری ہے، ایک جیسا ہونا ضروری ہے۔ ایک پہیہ، دوسرے پہیے سے ذرا سا چھوٹا کر دیجیے اور گاڑی کو چلایے!! پھر دیکھئے کہ ہوتا کیا ہے۔ یہ چھوٹا ہونا تو ایک طرف رہا، یہاں تو بنیاد ہی آپ تعلقات کی رکھتے ہیں یعنی عورت کو آپ نے ہمیشہ عورت کو چھوٹا پہیہ قرار دیا۔ پھر جو گاڑی یاں چلتی ہیں آپ نے تو دیکھ لیا کہ چھوٹا تو ایک طرف رہا اگر صورت یہ ہو جائے کہ ایک پہیہ گول ہو، دوسرا چوبرا ہو“ تے دیکھو چورا ہے تے اوس گلڈی دا حال، جو کچھ ہو یا ہوندا ہے ②، چورا ہے میں دیکھنے کی ضرورت کیا ہے؟ عزیزانِ من! ہر گھر میں وہ گاڑی دیکھئے کہ کیا ہو رہی ہوتی ہے۔ وہ تو ان بیچاریوں کا صبر ہے کہ ہم نے ان کو اس پوزیشن میں باندھ کر رکھا ہوا ہے کہ

نہ تڑپنے کی اجازت ہے نہ فریاد کی ہے

گھٹ کے مر جاؤں یہ مرضی میرے صیاد کی ہے

### گھریلو زندگی کو جنتی ما حول عطا کرنے کا طریق

وہ اُف نہیں کر سکتی لیکن وہ سمجھتا ہے کہ میں نے ان پر ظلم کر کے ان کا کچھ بگاڑا ہے، کم بخنو! آدمی آبادی انسانیت کی جن کو آپ اس حالت میں رکھتے ہیں پھر انسانیت آگے قدم بڑھا کیسے سکے گی؟ تو جو عذاب ہمارے ہاں آئے ہوئے ہیں، ان میں بیشتر وجہ یہ ہے! گھر میں مساوات کی زندگی، تعلیم کی زندگی، احترام کی زندگی، ایک دوسرے کے ساتھ رفاقت کی زندگی، بسر پیچھے۔ دیکھئے! اس میں آپ کے گھر کا نقشہ کیا ہوتا ہے، آپ کو کتنا سکون قلب حاصل ہوتا ہے، بچوں کی تربیت کیسے ہوتی ہے، باہر کے معاشرے میں آپ کی *Balanced Personality* (متوازن شخصیت) کیا چیزیں پیدا کرتی ہیں! یہاں تو مصیبت یہ ہوتی ہے کہ صبح بیوی سے لڑ کر جاتا ہے، بد قسمتی سے اگر مجرم ہو تو اسے ”تباہ پھانسی دے دیندا ہے“ گناہ نوں جا کے غصہ کھتوں دا کلڈ ھدا اے کتھے جا کے ③، آپ دیکھئے گا! باہر کے معاملے میں جو لوگ چڑھتے ہو جاتے ہیں، ان کا *(توازن)* کہاں ہوتا۔ ان کے گھر کی زندگی کا مشاہدہ کیجیے آپ کو معلوم ہو جائے گا کہ اذیت نا کی کا سرچشمہ

① اب کے ایک دفعہ تو نکل آؤں پھر تجھے گرالوں گا۔

② تو پھر چورا ہے پدیکھو کہ اس گاڑی کا کیا حال ہوا ہوتا ہے۔

③ تو بیگناہ کو پھانسی دے دیتا ہے۔ کہاں کا غصہ کہاں نکالتا ہے۔

بات نکلی کہاں جا کر؟ قرآن یہ کرتا ہے عزیزانِ من! کہ (ایک اعتدال پر قائم ذات، متوازن ذات) گھر کے اندر بنتا ہے اور وہ اسی صورت میں بن سکتی ہے کہ یہ جو وزون ہیں، گاڑی کو چلانے کے لیے ان کے اندر یکسانیت ہو، ہم آہنگی ہو، فاقت ہو، احترام ہو، ایک دوسرے کے لیے تعظیم ہو۔ پھر دیکھئے! کہ آپ کے معاشرے کا نقشہ کیا بتا ہے؟ کہا ہے کہ وَلَا تُمْسِكُوهُنَّ خَرَارًا لِتَعْتَدُوا وَمَنْ يَفْعُلْ ذَلِكَ (2:231) ان عورتوں سے دوبارہ نکاح اس نیت سے نہ کرو کہ ان پر زیادتی کر کے انہیں تکلیف پہنچائی جائے۔ آہا! یہ قرآن ہے، عزیزانِ من! جو ایسا کرتا ہے اس نیت سے اس کو یوں کو باندھ کر رکھتا ہے، بظاہر یہ نظر آتا ہے کہ یہ اس پر ظلم کر رہا ہے۔ غور سے سینے عزیزانِ من! قرآن ہے کہ کہتا ہے کہ وَمَنْ يَفْعُلْ ذَلِكَ فَقَدْ ظَلَمَ نَفْسَهُ (2:231) جو ایسا کرتا ہے بظاہر دل میں خوش ہوتا ہے کہ میں اس پر ظلم کر رہا ہوں۔ کم بخت! اپنے آپ پر ظلم کر رہا ہوتا ہے۔ واہ واہ واہ واہ کیا یہی خوب کہا!

### عالیٰ زندگی میں قرآنی قوانین کا اتباع نوع انسانی کے لیے باعث سکون قلب ہیں:

دیکھا عزیزانِ من! قرآن کی عظمت کتنی ابھر کر سامنے آ جاتی ہے کہ فَقَدْ ظَلَمَ نَفْسَهُ (2:231) اپنے آپ پر ہی ظلم کر رہا ہے اور یہاں کہا ہے وَلَا تَتَعْجُلْ أَيْتَ اللَّهُ هُنُّوا (2:231) دیکھنا! خدا کے قوانین کو مذاق نہ بنالیا۔ یہ قوانین کیا ہیں؟ کہا کہ وَأَذْكُرُوا نِعْمَتَ اللَّهِ عَلَيْكُمْ (2:231) یہ تمہیں قوانین دے رہا ہے یہ خدا کی نعمت ہیں۔ ہر نماز کی ہر رکعت کے اندر دعا یہ مانگتے ہیں کہ راستہ ہم کو دکھا صراطِ الَّذِينَ أَنْعَمْتَ عَلَيْهِمْ (1:7) ان کا راستہ دکھا جن پر تو نے اپنا انعام کیا ہے اور آپ دیکھ رہے ہیں کہ یہ منعمِ علیہ ہمارے ہاں تو پھر اس کے بعد ہن میں وہی نقشے آتے ہیں کہ تقویٰ پر ہیز گاری جو ہم نے اپنے ہاں تصور بنارکھا ہے۔ کہتا ہوں قرآن سے آپ اگر نعمت خداوندی کی آیاتِ اکٹھی کریں گے تو آپ کو سمجھ میں آئے گا کہ کن کا راستہ دیکھنے کی آپ امیدیں اور آورزوں میں لے کر خدا کے حضور جاتے ہیں لیکن ہم تو نہ کوئی امید لے کر جاتے ہیں، نہ کوئی آرزو، بس چند لفاظ ہیں جو ہم نے زبانی یاد کر رکھے ہیں، وہ پڑھ رہے ہوتے ہیں۔ وہ بھی اگر وہ امام صاحب پڑھ رہے ہوں ”تے اسی اوتحلوں وی کھر کن ڈے ہونے آں<sup>①</sup>“ اور اگر پڑھ رہے ہوتے ہیں تو طوطے کی طرح دھرارہے ہوتے ہیں ورنہ آپ سوچیے! کہ خدا کے حضور اتنی مرتبہ دن میں آرزو کر جاتے ہیں، رو بہ قبلہ ہو کر اس سے کہتے ہیں، ان کا راستہ دکھا جو منعم علیہ تھے اور یہاں کہا ہے کہ یہ جو عالیٰ زندگی کے متعلق ہم نے تمہیں قوانین دیے ہیں جن سے یہ زندگی خوشگوار بنے گی، یہ خدا کی نعمت تھی۔ ہم آرزو کرتے ہیں دل میں کھڑے ہو کر کہ یا اللہ! ان لوگوں کا راستہ دکھا جن کے گھر کی زندگی جنت کی زندگی ہے۔ دیکھا! آپ کے ہاں آرزوں میں کہاں آتی ہیں؟ کیا آرزو آپ لے کے جاتے ہیں؟ ان کی زندگی، ان کا راستہ دکھا جن کے گھروں کی جوزندگی ہے اس قسم کی جنت بدآ ماں فضاؤں کی زندگی ہے، جسے تو نے اپنی نعمت قرار دیا ہے۔

<sup>①</sup> تو ہم وہاں بھی خارش کر رہے ہوتے ہیں۔

گھریلو زندگی میں زوجہ کی حیثیت کی بجائے داروغہ کا تصور حکمرانی کی ذہنیت پر منی ہے عزیزان من! گھر میں خدا کی نعمت اس طرح سے آتی ہے اور جو نہیں آپ نے گھر کے اندر اس سے کہا کہ مرد داروغہ عورتوں کے اوپر تو آپ سمجھ سکتے ہیں ”فیرتے او تھانیدار تے حوالات دے قیدی دی زندگی ہے<sup>①</sup>“ بڑی نعمت خداوندی ہے صاحب! نعمت اللہ علیکم و مَا أنزَلَ عَلَيْکُمْ مِّنَ الْكِتَابِ وَالْحِكْمَةَ يَعْظُمُكُمْ بِهِ (2:231) خدا نے قانون نافذ کیے۔ میں نے عرض کیا کہ قرآن کریم کا ایک اعجاز اور بھی ہے۔ ایک قانون ڈکٹیٹر دیتا ہے، ملکیت کے قوانین کے ایسا کرنا ہو گا۔ اس کا سوال ہی نہیں ہے کہ کیوں کرنا ہو گا۔ ایسا کرنا ہو گا بس حکم حاکم مرگِ مفاجات، ہمارا حکم ہے ایسا کرنا ہو گا۔ اس کے اندر پوری ملکومیت ہوتی ہے۔ ایک قانون ہوتا ہے جس قانون بننے سے پہلے یہ بتایا جاتا ہے، کہ حالات ایسے پیدا ہو چکے ہیں اس میں اصلاح کا تقاضا یہ ہے اس تقاضے کے لیے ہم نے کچھ پابندیاں تجویز کی ہیں۔ یہ پابندیاں دی جاتی ہیں اگر ان کے اوپر عمل پیرا ہو گئے تو اس کے نتائج ایسے خوشگوار نکلیں گے۔ یہ جو ہوتا ہے کہ قانون سے پہلے اس قانون کا Objective دینا، یہ بتانا کہ یہ قانون کیوں نافذ کیا جا رہا ہے The why of it (اس کی مصلحت کیا ہے، تقاضا کیا تھا) اس کے نتائج کیا نکلیں گے، اسے حکمت کہتے ہیں۔ اب یہ چیز ہو سکتی ہے کہ وہ صرف قانون دے، حکمت اس کی ہم خود وضع کر لیں۔ اس نے کہا کہ نہیں! اس میں دھوکا کھا جاؤ گے۔ ہم نے جب کہا ہے کہ اس قسم کی زندگی پیدا کرو تمہارے نتائج اچھے خوشگوار نکلیں گے، اب خوشگوار نتائج تو آپ خود اپنے ذہن میں بھی متعین کر سکتے ہیں کہ گھر میں صاحب ایروزا آپ کے ہاں ہوتا ہے کہ صاحب! گھر چل ہی، اس صورت میں سکتا ہے کہ گھر کے اندر ایک بادشاہ ایک حاکم ہونا چاہیے۔ اب اگر آپ نے وہاں یہ ہنتر کی جوزندگی ہے بسر کی وہاں آپ نے ایک بادشاہ بنالیا، ایک حاکم بنالیا اور اس کے بعد اپنے احکام کو آپ ڈنڈے کے زور سے منواتے چلے گئے، ٹھیک ہے بیوی بھی بڑی دلکشی پڑھی ہے، بچے بھی سہمے ہوئے ہیں یہ سب کچھ ہور ہے ہیں۔ اپنے ذہن میں آپ سمجھ رہے ہیں اور باہر بھی کہہ رہے ہیں کہ صاحب! جیسا ڈپلن میرے ہاں ہے، میں نے کہیں کم دیکھا ہو گا، کسی کو جرأت نہیں ہے کہ سامنے سے چوں کر سکے۔ آپ نے خود متعین کر لیا کہ نتائج بڑے خوشگوار نکل رہے ہیں اور یہ اپنے ذہن سے نتائج کا متعین کرنا ہی تو ہے جہاں یہ آپ کے مذاہب مختلف اور اس کی شریعتیں مختلف اور اتنے قوانین مختلف ہیں۔ ہر شخص مطمئن ہوتا ہے کہ کل حصہ بمالدیہ ہم فریحون (32:30) ہرگروہ مگن ہوتا ہے کہ ہم جس طریق پر چل رہے ہیں بالکل صحیح ہے۔

### قانون (ضابط حیات)، نتائج اور حکمت کا تعلق:

قرآن کہتا ہے کہ صرف قانون کا دینا ہی ضروری نہیں ہوتا، یہ بتانا بھی ضروری ہوتا ہے کہ ایسا کرو گے تو اس کا یہ نتیجہ نکلے گا۔ وہ نتیجے کو بھی متعین کر دیتا ہے۔ کیوں متعین کرتا ہے؟ تاکہ انسان فریب میں نہ رہے۔ اگر وہ نتیجہ نکلتا ہے تو سمجھ لجیے کہ اس قانون پر عمل ہو رہا ہے اور اگر وہ نتیجہ نہیں نکل رہا تو پھر سمجھئے کہ ہم کہیں غلطی کر رہے ہیں۔ آپ کو کھڑے ہو کر دوبارہ سوچنا

<sup>①</sup> پھر تو وہ تھانیدار اور حوالات کی زندگی ہے۔

پڑے گا۔ ٹریک سگنل کے مطابق چلو گے تو Accidents (حوادث) نہیں ہوں گے۔ یہ اس کی حکمت ہے۔ ٹریک کے سگنل کے مطابق چلو یہ۔ کتاب ہے Accidents نہیں ہوئے۔ یہ حکمت ہے۔ اگر اس کے باوجود Accidents (حوادث) ہوتے ہیں تو یہ قانون بنانے والے کھڑے ہو کر سوچتے ہیں کہ کہیں کوئی Defect چیز رہ گئی ہے پھر اس میں وہ Improvement کرتے ہیں۔

### کیا ہم نے صدیوں سے صلوٰۃ کے اجتماعی نظام کو عملی طور پر نظر وں سے اوچھل کر رکھا ہے؟

خدانے جو قوانین دیے ہیں ان قوانین پر عمل پیرا ہونے سے جو نتیجہ مرتب ہونا ہے اس نے خود ہی بتا دیا ہے کہ ایسا ہو گا تا کہ اپنے آپ کو فریب میں نہ رکھتے جاؤ۔ یہ کہا ہے کہ جو صلوٰۃ ہے یہ تَنْهِي عَنِ الْفَحْشَاءِ وَالْمُنْكَرِ (29:45) صلوٰۃ، فحشا اور منکر سے روکے گی۔ صلوٰۃ، کتاب ہے۔ حکمت، قانون ہے۔ حکمت، فحشا اور منکر سے روکے گی۔ ہر ایسی چیز جو معاشرہ کے اندر نامعقول ہو Reason کو اپلی نہ کرے، بیہود گیاں پھیلائے، صلوٰۃ بس کو روکتی ہے۔ یاد رکھیے! منکر کے معنی عقل فریب کار کی حیلہ کاریاں ہوتی ہیں۔ یہ بتایا ہے کہ الصلوٰۃ یہ کرے گی۔ اب کچھ بھی آپ نام رکھ لیجیے، کوئی بھی چیز آپ کر لیجیے اگر وہ یہ نتیجہ پیدا کرتی ہے تو وہ اُمت خدا کے مقرر کیے ہوئے صلوٰۃ کے اوپر عمل پیرا ہے اور اگر آپ مطمئن ہیں کہ نماز بالکل صحیح ہو گئی اور یہ نتیجہ پیدا نہیں ہو رہا تو پھر تدوین میں سے ایک شکل ضرور ہو گی: یا تو یہ کہ (معاذ اللہ معاذ اللہ) خدا نے یہ بات یونہی کہہ دی تھی صاحب! یہ صلوٰۃ اس کے ارکان کے ساتھ بالکل تادیاً پڑھی جا رہی ہے، پاؤں میں اتنا فاصلہ، ہاتھ وہاں تک اٹھیں، رکوع میں یوں جاؤ تو یہ زاویہ بنئے، سجدہ اس طرح سے ہو رہا ہے، یہ ساری اس کی جزئیات ٹھیک ٹھیک طے ہو رہی ہیں لیکن معاشرے کے اندر فحشا اور منکر سے نہیں روکا جاتا۔ تو کھڑے ہو کر سوچنا پڑے گا کہ یہ نتیجہ تو مرتب نہیں ہو رہا، کہیں غلطی ہو رہی ہے صاحب! اس کے بعد اس کو Continue تو کوئی نہیں کرے گا کھڑا ہو کر سوچے گا اور اگر ہم نے اس کا نتیجہ خود ہی ذہن میں مرتب کر لیا کہ اس سے انسان کو سکون حاصل ہوتا ہے، ثواب ملتا ہے، آخرت میں نجات مل جائے گی تو معاملہ ختم ہے۔

ٹھیک ہے آپ نے دیکھا کہ کتاب کے ساتھ حکمت جو خود ہی قرآن نے دی ہے کتنی بڑی چیز ہے! یہ Pragmatic (استنباتی ٹسٹ) ہے۔ اس کے جو نتائج ہیں اور ثابت کریں کہ حکم کے اوپر صحیح عمل ہو رہا ہے۔ اگر وہ نتائج مرتب نہیں ہو رہے تو حکم پر عمل نہیں ہو رہا کیونکہ (معاذ اللہ) ہم یہ تو پھر نہیں کہیں گے کہ خدا نے یہ بات یونہی کہہ دی، ہم تو ٹھیک طریقے کے اوپر صلوٰۃ ادا کرتے ہیں، نتائج یہ نہیں نکلتے تو پھر یہاں کوئی غلطی ہوئی ہے۔ (معاذ اللہ معاذ اللہ) یہ تو ہم نہیں کہہ سکتے کہ خدا نے یونہی کہہ دیا ہے، ہمارا تو ایمان ہے: صلوٰۃ کتاب ہے، کتاب کے ساتھ قانون ہے قانون اپنا نتیجہ مرتب کرتا ہے اور حکمت اس قانون کی (اس کی وجہ جواز) ہے جو ہم فراموش کر چکے ہیں۔

## صلوٰۃ کے نظام کو صرف نماز کی جذبات تک محدود کرنے کا نتیجہ

قرآن نے صلوٰۃ کی حکمت یہ بتائی ہے اتنا ہی نہیں کہ اس نے یہ چیز کہی بلکہ اس نے تو یہ بھی کہا ہے کہ مصلین وہ بھی ہیں جو تکنذیب دین کرتے ہیں۔ وہ جو **يُكَذِّبُ بِاللّٰهِيْنِ** (107:1) ہے اس میں **فَوَيْلٌ لِّلْمُصَلِّيْنَ** **الَّذِيْنَ هُمْ عَنِ الصَّلَاةِ تَرَكُّمْ سَاهُوْنَ** (107:4-5) ہے کہ مصلین یعنی وہ جو ہمارے ہاں کے فارم، طریقے مقرر ہیں ان کے مطابق صلوٰۃ ادا کرے گا، ورنہ وہ تو امام صاحب وہاں اس طرح صلوٰۃ نہیں ادا کرنے دیں گے۔ نماز پڑھ رہا ہے، اس نے کہا ہے کہ مصلین کے لیے تباہی ہے۔ **أَرَيْتَ الَّذِيْ يُكَذِّبُ بِاللّٰهِيْنِ** (107:1) کبھی کبھی تم نے اس کو بھی دیکھا ہے جو دین کی تکنذیب کرتا ہے، کفر نہیں کرتا، انکار نہیں کرتا، عملًا جھٹلار ہاہے۔ عملًا جھٹلانے کے کیا معنی ہیں؟ اللہ اکبر! کہہ رہا ہے کہ صلوٰۃ صحیح ادا کر رہا ہوں۔ خدا نے کہا تھا کہ یہ تنہا اور فرشا اور منکر سے روکے گی، نہیں روک رہی۔ یہ کیا کر رہا ہے؟ یہ خدا کے اس دعوے کو جھوٹا ثابت کر رہا ہے۔ اللہ اکبر! اف اف اف!! **أَرَيْتَ الَّذِيْ يُكَذِّبُ بِاللّٰهِيْنِ** **فَذِلِّكَ الَّذِيْ يَدْعُ الْيَتِيْمَ** **وَلَا يَعْظِضُ عَلَى طَعَامِ الْمِسْكِيْنِ** (107:1-3) دعویٰ کر دین کا، اسلام کا۔ اس کی کیفیت کیا ہے؟ کہ دین کو جھٹلار ہاہے۔ کیا کر رہا ہے؟ یہ کہ جو معاشرے میں تنہارہ جاتا ہے، یہ اس کے ساتھ کھڑا ہونے کی اس کو بجائے دھکا دیتا ہے، جو بھوکا سوتا ہے اس کی روٹی کا انتظام نہیں کرتا۔ **فَوَيْلٌ لِّلْمُصَلِّيْنَ** **الَّذِيْنَ هُمْ يُرَءُوْنَ** (107:4-5) نماز میں پڑھتا ہے، مطمئن ہو جاتا ہے کہ فریضہ خداوندی ادا ہو گیا۔ قرآن کہتا ہے کہ تکنذیب کرتا ہے۔ کرتا کیا ہے؟ یہ کہ **هُمْ عَنِ الصَّلَاةِ تَرَكُّمْ سَاهُوْنَ** **الَّذِيْنَ هُمْ يُرَءُوْنَ** (107:5-6) وہ تو یہ کرتا ہے جو لوگ دیکھ سکتے ہیں کہ ٹھیک ہے جی! نماز ہو گئی۔ **وَيَمْنَعُونَ الْمَأْعُوْنَ** (107:7) جو کچھ نظر آتا ہے وہ کچھ تو ٹھیک ٹھیک کر کے چلا آتا ہے اور رزق کے ان وسائلوں کو جو چشمتوں کی طرح بہتے ہوئے ہر گھر کے سامنے سے گزرتے چلے جانے چاہئیں تھے، یہ ان کو بند لگا کر روک کے بیٹھ جاتا ہے۔ یہ مصلین ہیں۔ یہ آؤں (107:6) والی چیز تو ان کی ساری صحیح ہے۔ کیا؟ تکنذیب دین کرتا ہے میں پھر دہرا دوں کہ خدا نے جو کہا تھا کہ صلوٰۃ یہ نتائج پیدا کرے گی، صلوٰۃ یہ نتائج نہیں پیدا کر رہی، اس کا خدا کو کیا جاتا ہے (معاذ اللہ) جھوٹا ثابت کرتا ہے کہ یونہی کہہ دیا تھا کہ کرے گی۔ بجائے اس کے کہا پنے آپ کو جھوٹا ثابت کرے کہ میں ہی صلوٰۃ پہ قائم نہیں ہوں، وہ کہتا ہے کہ میری صلوٰۃ بالکل ٹھیک ہے، مولوی صاحب فتویٰ دے دیتے ہیں کہ نماز ہو گئی۔ نماز ٹھیک ہو گئی، نتیجہ یہ نہیں لکھتا۔ کبھی کہنے کے لیے یہ توجہات نہیں کرتا کہ میں ہی غلطی پڑھا۔ برادر ان عزیز! اس کا Logical Conclusion (منطقی نتیجہ) یہ ہے کہ یہی چیز غلط ہے کہ وہ **يُكَذِّبُ بِاللّٰهِيْنِ** (107:1) دین کی تکنذیب کرتا ہے۔ **يَعْظُلُكُمْ إِنْهُ** (131:2) کتاب اور حکمت۔ **وَأَنْقُوا اللّٰهَ** **وَاعْلَمُوا أَنَّ اللّٰهَ بِكُلِّ شَيْءٍ عَلِيْمٌ** (2:231) (2) قوانین خداوندی کی نگہداشت کرو اچھی طرح سے سمجھ رکھو۔ یہی نہیں ہے کہ تم نے محسوس طور پر مری طور پر جو اس کی شکل، یہ اس کی جو چیزیں ہیں، وہ ادا کر دیں اور سمجھ لیا کہ وہ چیز ہو گئی۔

بِكُلِّ شَفَاعَةٍ عَلَيْهِمْ (۲:۲۳) ہر شے کا علم رکھتا ہے وہ یہ دیکھ رہا ہے کہ یہ صلوٰۃ یمنانج پیدا کرتی ہے یا نہیں۔

### خدا تعالیٰ کی حاکمیت اور انسان کی ڈکٹیٹر شپ میں بنیادی فرق:

میں نے عرض کیا تھا کہ قرآن نے کتاب کے ساتھ حکمت کو منزل من اللہ کیوں کہا ہے؟ اور یہ چیز ہے کہ جو اسے قادر مطلق ہونے کے باوجود ڈکٹیٹر نہیں بنارہی۔ ڈکٹیٹر کو یہ بتانے کی ضرورت نہیں ہوتی کہ میں یہ حکم کیوں دے رہا ہوں، اس کا نتیجہ کیا نکلے گا؟ اس کا ہر حکم اس کے فاوے کے لیے ہوتا ہے وہ اپنے فائدے کے لیے دیتا ہے۔ یہ جو حکم دیتا ہے یہ تمہارے فائدے کے لیے دیتا ہے، اس لیے ساتھ بتاتا ہے کہ اس کا نتیجہ کیا نکلے گا۔ ڈاٹر جو دوائی تجویز کرتا ہے، اس کے بعد آپ کو بتاتا ہے کہ بھی! اگر تین مرتبہ یہ پیو گے اور یہ پڑا ساتھ کھاؤ گے تو اس کے بعد شام تک بخار اتر جائے گا یا ملکا تو ضرور ہو جائے گا۔ یہ اس کی حکمت ہے۔ شام کو اگر آپ دیکھتے ہیں، ٹپر پچر لیتے ہیں، بخار نہیں ٹوٹا بلکہ بھی نہیں ہوا تو آپ کو ہدھرے ہو کر سوچنا پڑتا ہے، خود ڈاکٹر کو سوچنا پڑتا ہے کہ کیا تشخیص غلط ہو گئی تھی، نسخ غلط ہو گیا تھا، دوائی غلط ملی ہے، استعمال غلط ہوا ہے۔ وہ کیوں اس چیز پر زور دیے چلا جا رہا ہے کہ کہیں غلط ہے؟ اس لیے کہ اس نے وہ نتیجہ پیدا نہیں کیا جو کرنا چاہیے تھا۔ ہمارے امراض کی تشخیص اس حاذق نے کی ہے جس سے برا کوئی طبیب نہیں ہو سکتا۔ نسخ اس حکم مطلق نے تجویز کیا ہے جس سے بہتر شفاءٰ یعنی فی الصُّدُور (۱۰:۵۷) کوئی نہیں ہے۔ یہ اس کا اعلان ہے یہ اس نے کیا ہوا ہے شفاءٰ لِلنَّاسِ (۱۶:۶۹) کہا ہے قرآن کو۔  
نسخ۔ اس نے تجویز کیا ہوا ہے لیکن

نہ دکھ جائے نہ درماں راس آئے

مگر خط دوا ہے اور میں ہوں

”مرض بڑھتا گیا جوں جوں دوا کی“ کی بنیادی وجہ غور و فکر کے عمل کو نظر انداز کرنا ہے:

بس یہ خط دوا ہی ہے۔ بخار نہیں ٹوٹ رہا نہیں اُتر رہا تو نہ سہی۔ صاحب! یہ کیا ہے؟ یہ کہ یہ تقدیر میں ہی ایسا لکھا تھا۔ چل بھی! معاملہ ختم ہوا۔ تقدیر صحیح ہے جو کچھ ہم کر رہے ہیں بھی! تدبیر بھی تو خدا کی بتائی ہوئی تھی کہ جی تقدیر بھی تو خدا کی مقرر کی ہوئی ہے۔ ہمیں وہ تدبیر بتاتا ہے کہ بخار ٹوٹے گا اُدھر تقدیر لکھتا ہے، خود بخار سے کہتا ہے کہ مت ٹوٹنا۔ عزیزان من! کیا کر رہے ہیں ہم؟ کیا کر رہے ہیں؟ نہیں سوچو یہ کہ کیا نہیں کر رہے۔ کرنے کے لیے تو اس نے ایک ہی بات کہی تھی کہ اے رسول! ان سے کہہ دو کہ إِنَّمَا أَعْظَلُكُمْ بِمَا حِلَّةٌ (۴۶:۳۴) میں تھیں صرف ایک بات کی نصیحت کرتا ہوں کہ آن تَقْوَةُ مُوالِيَه مَشْتَقَه وَفُرَادِي (۳۴:۴۶) ایک ایک دو دو کر کے ہدھرے ہو جاؤ میری بات سن لو یہ کرنے کا کام ہے۔ پوچھا کہ کیا کہتے ہیں؟ ایک کام ہے، لمبا چوڑا پروگرام ہی نہیں ہے وہ یہ ہے کہ ثُمَّ تَتَفَكَّرُوا فَ (۳۴:۴۶) ہدھرے ہو کر سوچا کرو کہ یہ نتیجہ کیوں نہیں نکلا۔ یہ ہے حکم۔

ہمارے معاشرے میں مطلقہ عورت کی حالت زار اور بیوہ کی اذیت ناکی کا پس منظر:

کیا ہے کہ **إِنْجَلِّ شَفِيعٍ عَلَيْهِمْ** (2:231) وہ جانتا ہے کہ آگے کہا کہ **وَإِذَا طَلَقْتُمُ النِّسَاءَ فَبَلَغْنَ أَجَلَهُنَّ فَلَا تَعْضُلُوهُنَّ** آن یعنی **عَنْ أَزْوَاجِهِنَّ إِذَا تَرَاضُوا بَيْنَهُمْ بِالْمَعْرُوفِ** ڈلک یو عظیبہ مَنْ كَانَ مِنْكُمْ يُؤْمِنُ بِاللهِ وَالْيَوْمِ الْأَخِرِ ڈلک از کی لکم وَأَطْهَرْ وَاللهِ يَعْلَمُ وَأَنْتُمْ لَا تَعْلَمُونَ (2:232)۔ طلاق یافتہ عورت جب عدت کی مدت کو پہنچ جائے تو پھر اسے اس بات سے نہ روکو کہ وہ جہاں کہیں نکاح کرنا چاہے اس کے راستے میں آپ روک بنیں۔

ہمارے معاشرے میں مطلقہ عورت کی حالت زار اور بیوہ کی اذیت ناکی کا پس منظر:

آپ کو معلوم ہے کہ ہمارے ہاں دونکا حموں کے نکاح کے اوپر کتنی شدت سے پابندیاں ہیں۔ کل تک کی یہ بات ہے مطلقہ کے متعلق تو نکاح ثانی کا سوال ہی نہیں تھا یعنی کسی کے متعلق کہنا کہ وہ مطلق ہے تو وہ بیچاری جیسے منہ چھپائے پھر رہی ہے۔ پتہ نہیں اس سے کیا جرم عائد ہو گیا ہے۔ یہ تصور کیوں پیدا کیا؟ یہ تو، ہی مرد کی حاکیت ہے داروغتیت ہے جس نے یہ تصور پیدا کیا جیسے ایک دفعہ کا بے گناہ قیدی بھی اگر قید سے چھوٹ کر آ جاتا ہے تو پھر معاشرہ اس کو وہ عزت کا مقام نہیں دیتا۔ بے گناہ قیدی بھی قید کاٹ کر آیا ہے، بس۔ یہ چونکہ اس نے عورت کو قیدی، مجرم بنائے اس داروغے اور حاکم نے رکھا تھا، اس نے کسی طرح سے چھٹکارا بھی حاصل کر لیا ہے تو مرد نے یہ تصور قائم کیا ہے کہ یہاں معاشرہ کے اندر عزت کی مستحق رہی نہیں ہے۔ باقی ساری عمر مَذْمُومًا مَذْحُورًا (18:17) دھنکاری ہوئی بیچاری ہے۔ طلاق ہوئی ہوئی ہے آپ کو معلوم ہے یہ بات کس طرح سے کہی جاتی ہے؟ یہ کیا چیز؟ کہ اور ہر طرح سے بھی اگر اس کو یہ آسانی ہے کہ حاصل کر لے تو یہ بات کہ اس کے بعد معاشرے میں منہ کیا دکھاؤں گی، اس سے رُکی رہی۔ پتہ نہیں کہاں کہاں ہم چلے گئے۔ کہا کہ دیکھئے! یہ بات نہ کہیں کہ پھر اگر یہ نکاح کرنا چاہتی ہے تو اس راستے میں روڑے اٹکانے شروع کر دو۔ مطلقہ ہے، اجازت ہی نہیں اس کو دی جاتی اور بیوگان کے متعلق تو آپ کو معلوم ہے، کل اس چیز کے لیے جہاد کرنا پڑا تھا کہ بیوہ عورتوں کی شادی ہونی چاہیے۔ اس لیے کہ یہ تو یہاں کا ہمارے ہاں کا، یہ سارا معاشرہ ہندوانہ ہے۔ ہندوانہ معاشرہ میں مطلق تو ہوتی نہیں تھی، وہاں طلاق تو ہوئی نہیں سکتی تھی۔ بیوہ ہو جاتی تھی، بیوہ کی شادی وہاں نہیں ہو سکتی تھی۔ ان کے ہاں نہیں ہو سکتی تھی، ہمارے ہاں بھی کیوں ہو صاحب؟ بیوگان کی شادی کے خلاف بہت بڑا جہاد کرنا پڑا تھا، پھر کہیں آپ کے ہاں جا کر یہ بندوٹا تھا اور بڑے بڑے ہمارے ہاں کے جوار بباب شریعت تھے ان کے گھروں میں بھی یہ صورت تھی کہ وہ بیوگان کی شادی نہیں کرتے تھے۔ قرآن نے کہا ہے کہ اس چیز کو نہ روکنا۔

قرآن حکیم کی طرف سے ملنے والے عالمی قوانین پر عمل پیرائی کا نتیجہ اور ترکیہ نفس کا مفہوم:

بات تو یہ دیکھئے کہ بظاہر چھوٹے عالمی زندگی کے متعلق قوانین ہیں جن کے متعلق گفتگو کی جا رہی ہے۔ کہا کہ اس شخص کو ہم یہ لصیحت کر رہے ہیں جو خدا اور آخرت پر ایمان رکھتا ہے۔ واہ! کتنی اہمیت حاصل ہو گئی ان قوانین کو! جو خدا اور

آخرت پر ایمان رکھتا ہے اس کے لیے یہ قوانین ہیں اور پھر جو ان قوانین کو مذاق بناتا ہے اس کے بعد یہ دعویٰ کہ ہم خدا اور آخرت پر ایمان رکھتے ہیں۔ یہ اس کے لیے کہا جا رہا ہے۔ آذکی لَكُمْ وَأَظْهِرْ (2:232) ہمارے ہاں توازن کی کے معنی بھی پاکیزہ کیے جاتے ہیں اور اطہر کے معنی بہت زیادہ پاکیزہ۔ قرآن یہاں دو الفاظ لے آیا۔ اذکی کے معنی ہیں ”نشود نما“۔ عالمی زندگی کے متعلق قوانین دے رہا ہے اور کہا ہے کہ جو ان کے مطابق یہ کچھ کرے گا اس کی ذات کی نشود نما ہوتی چلی جائے گی، زندگی بڑی پاکیزہ گزرے گی۔ اندر ایک انقلاب پیدا ہوتا ہے وہ تو یہ ہے جسے تزکیہ کہا جاتا ہے۔ ہمارے ہاں تو تزکیہ نفس بات ہی اور ہوتی ہے۔ یہ چیز ہے اندر ایک انقلاب پیدا ہوتا ہے۔ باہر کے معاشرے کے اندر زندگی بڑی پاکیزہ گزر رہی ہے اور آپ جانتے ہیں پاکیزگی صرف یہی نہیں ہے کہ کپڑے اجلے ہوتے ہیں، دھنے ہوتے ہیں، نہایا دھویا ہوا ہوتا ہے۔ اگر یہ معیار ہو تو اس صورت میں تو ہمارے ہاں کا یہ سب سے بڑا طبقہ جس کی زندگی میں پاکیزگی کا کوئی نشان نہیں ہوتا، سب سے زیادہ پاکیزہ ہوتا ہے۔ جسے آپ Good Personality کہتے ہیں کا حامل شخص۔

### لفظ Personality کا اور مظہر کا یقینی مفہوم

آپ کو پتہ ہے کہ آج کل ہمارے ہاں Personality (شخصیت) کے معنی کیا ہوتے ہیں؟ یہ کہ سچیلاں جو جان، سختا، Well Dressed شیوا چھا کیا ہوا، ویز لین کے ساتھ بال جمائے ہوئے، پالش بھی وہ جس میں چمک پیدا ہو رہی ہے، کریز بھی انتہائی اعلیٰ، نائی میچ کر رہی ہے۔ یہ جو ساری چیزیں ہیں، یہیں جو آج صحیحی جاتی ہیں۔ یہ قرآن ہے آذکی لَكُمْ وَأَظْهِرْ کہا ہے اور پھر آگے کہا کہ وَاللّهُ يَعْلَمُ وَأَنْتُمْ لَا تَعْلَمُونَ (2:232) یہ جو بظاہر میں نے باتیں کہی ہیں، یہ تو ہم بھی جانتے ہیں۔ کہتا ہے کہ اس سے آگے ایک اور معاملہ ہے، اسے تم نہیں جانتے، اسے ہم جانتے ہیں کہ ان چیزوں کی پابندی سے جو ایک انسان کے اندر صحیح انقلاب پیدا ہوتا ہے اسی کے مظاہرے کا نام پاکیزہ زندگی ہے پاکیزہ سیرت ہے۔ وہ جو قرآن نے کہا تھا کہ قرآن کے لیے کہا ہے کہ لَلَا يَمْسَأَ إِلَّا الْمُظَهَّرُونَ (56:79) یہیں نہیں کر سکتے اس کو جو جو جان کے جو مظہر ہوں۔ ہمارے ہاں تو وہ اتنی سی بات ہوئی کہ وہ پاک صاف ہو کر غسل کر کے وضو کر کے قرآن کو چھوٹا چاہے یہ یوں معنی ہوئے یہ دونوں چیزیں غلط ہیں۔ کہا کہ جس کے قلب و نگاہ کے اندر پاکیزگی نہیں ہے تو اس کو قرآن سے کچھ مس ہی نہیں ہو سکتا۔ یہ ہے اطہر یعنی قلبی اور ذہنی پاکیزگی، جن کا ظاہر و باطن پاکیزہ ہو، جو متوازن دل و دماغ کے مالک ہوں، جو اپنے ذہن کو تمام تھیات سے خالی کر کے اپنے دلوں کو تمام ذاتی روحانیات و میلانات سے منزہ رکھیں ①۔

### عورت کے لیے رضاعت اور ننان و نفقہ کا مسئلہ:

برادران! یہاں تک بات ہو گئی مطلقاً کے نکاح کی۔ اولاد ہے، چھوٹے بچے ہیں، ان کے دودھ پلانے کا مسئلہ ہے جسے رضاعت کہتے ہیں۔ کہا کہ وَالوَالِدُونَ يُؤْخِذُونَ أَوْلَادَهُنَّ حَوَالَيْنِ كَامَلَيْنِ لِمَنْ أَرَادَ أَنْ يُتَمَّمَ الرَّضَاعَةُ

① ان نکات کی مزید تفصیل کے لئے دیکھئے، پرویز: لغات القرآن جلد سوم، ادارہ طلوع اسلام، لاہور 1961ء، ص: 1094 تا 1094

(2:233) دودھ پلانے کے لیے جسے آپ رضاعت کہتے ہیں، وہ قرآن کریم نے یہ کہیں حکم نہیں دیا کہ ہر ماں اپنے بچے کو کتنے عرصے تک دودھ پلانے۔ یہ تو میں ایک ہی چیز ہے کہ کتنی ضرورت ہے، کتنا پلاسکتی ہے، ایسی بھی صورت ہو سکتی ہے کہ ماں کے دودھ ہی اتنا نہیں ہے، فیڈنگ اتنی ہونیں سکتی یا بچہ ہضم نہیں کر سکتا۔ قرآن نے یہ متعین نہیں کیا۔ اگرچہ قرآن نے دو جگہ یہ بات کہی ہے عام طور پر بچے کے متعلق کہا ہے کہ اس کے حمل کا اور دودھ پلانے کا وقفہ قریباً اڑھائی سال ہوتا ہے (15:46) یہ قرآن نے عام طور پر ایک بات کہی ہے، یہ حکم نہیں ہے۔ دوسری جگہ دو سال کا بھی کہا ہے (31:14) یہی حکم نہیں ہے۔

اب یہاں بچے کو دودھ پلانے کے متعلق قانون بات آگئی۔ طلاق ہو گئی، دودھ پینے والا بچہ ہے۔ دیکھئے قرآن ہے۔ اس بچے کے حقوق کی حفاظت کا بھی اس کو خیال ہے۔ کہا ہے کہ والدہ اس بچے کو دو سال کے لیے دودھ پلانے اگر اس زمانے کو پورا کرنا ہے، اس کا ارادت ہوتا ہے۔ یہ چیز اب مجبوراً نہیں ہے، یہ ضروری نہیں ہے کہ اس عورت کو قانوناً مجبور کیا جائے کہ تو ضرور اس بچے کو دودھ پلا۔ ہو سکتا ہے اس کے حالات اس کی اجازت نہ دیں، ہو سکتا ہے اس نے جہاں شادی کرنی ہے، وہاں یہ شرط عائد ہو جائے، اس کے راستے میں یہ چیز حاصل ہو جائے اور قرآن میں جسے بچوں کی Guardianship (سرپرستی) کہتے ہیں، اس کے لیے بھی خود کوئی قانون نہیں دیا۔ وہ ایک فقرہ دیا ہے، میں آگے عرض کروں گا، جامع ہے کہ دو سال کے لیے کہاں بچہ رہنے چاہئیں۔ وَعَلَى الْمَوْلُودِ لَهُ رِزْقُهُنَّ وَكِسْوَتُهُنَّ بِالْمَعْرُوفِ (2:233) جس کا یہ بچہ ہے، اس کے لیے ضروری ہے کہ اس مدت میں جب تک یہ دودھ پلانے کا معاملہ اس سے طے ہوا ہے، اس کے نان نفقة کی ذمہ داری اس کے اُپر ہو گی یعنی کھانے پینے کی بھی اور پہنچنے کی بھی۔ لَا تُكَلُّفْ نَفْسٍ إِلَّا وُسْعَهَا (2:233)۔ اب سوال پیدا ہوا کہ کتنا لینا چاہیے۔ خود نہیں مقرر کیا۔ قاعدہ کیا مضر کیا؟ یہ کہ ایسی صورت جس میں اس کے اُپر یہ چیز بوجھنے ہو، جیسے گھر کی زندگی کے اندر یا اپنے بچوں کو پالتا تھا، اس بیوی کی ضروریات پوری کرتا تھا، بس اسی معیار کے مطابق یہ کچھ ہو گا۔

ازدواجی زندگی میں رضاعت کے لیے قرآن حکیم کی وسعتوں کا معیار بیٹھ کر خود طے کرو:

خدا یہ چاہتا ہی نہیں ہے کہ اپنی طرف سے مقرر کر کے خواجوہ تمہیں تکلف میں ڈال دے۔ شریعت کے اندر خدا کی مقرر کی ہوئی بڑی وسعتیں ہیں، عزیزان من! اصولی حدود کو تو وہ اتنا سختی سے رکھتا ہے کہ یہاں سے تم نے تجاوز کیا تو گئے جہنم میں۔ ان کے اندر بڑی وسعتیں رکھتا ہے تمہیں بڑی آزادیاں دیتا ہے۔ لَا تُضَارَّ وَالِّدَةُ بُولَدِهَا وَلَا مَوْلُودُ لَهُ بُولَدِهَ (2:233) یہ ہے جو وہ فقرہ۔ اصول یہ یاد رکھو! اگر تمہارے ہاں یہ انقطاع تعلقات کا ہوا ہے تو اب یہ نہ ہو کہ یہ بچے کی موجودگی یا ماں کو مصیبت میں ڈال دے یا باپ کو ایک مصیبت میں ڈال دے۔ بات بیٹھ کے طے کرو کہ کیا قانون ہونے چاہئیں صاحب! اصول یہ ہونا چاہیے کہ اس بچے کی موجودگی کی وجہ سے نہ ماں کسی مصیبت میں پھنس جائے نہ باپ کے لگے کے اندر یہ ایک مصیبت بن جائے۔ یہ طے کر دتم خود طے کرو۔

بچے کے باپ کی وفات کی صورت میں ورثا کی ذمہ داریاں اور رضااعت کا مسئلہ اگر اس اثنامیں بچے کا باپ فوت ہو جائے تو پھر یہ ذمہ داری کس پڑتی ہے؟ کہا ہے کہ وَعَلَى الْوَارِثِ مِثْلُ ذلِكَ (2:233) بچے کا باپ فوت ہو گیا ہے تو ہمارے ہاں تو کہتے ہیں کہ لاوارث رہ گیا۔ وہ کہتا ہے کہ نہیں وہ جو مرنے والے کے ورثا ہیں یہ ساری ذمہ داریاں ان پر منتقل ہو جائیں گی، وہ یہ کریں گے۔ تو کہا کہ فَإِنْ أَرَادَ اِذْفَالًا عَنْ تَرَاضِّهِمَا وَتَشَاؤِرٍ فَلَا جُنَاحَ عَلَيْهِمَا (2:233) دوسال سے پہلے ہی، باہمی رضامندی سے اور مشاورت سے دیکھ لجھے۔ طلاق شدہ یہ جوڑا ہے تعلقات ازدواجی منقطع ہو رہے ہیں، ایک معاملے کا فیصلہ کرنا ہے اس کو یہ کہتا ہے باہمی رضامندی سے باہمی مشاورت سے یہ حیزکی جائے۔ ہمارے ہاں تو مشاورت ان میں بھی نہیں ہوتی جن میں تعلقات چولی دامن کے ہوتے ہیں۔ یہاں ان میں مشاورت کر رہا ہے جن میں اب تعلقات ہی باقی نہیں رہے ہوئے۔ کہا ہے کہ جو تعلقات تو معاہدے کے تھے وہ فتح ہوئے، تمہارے ہاں انسانیت کے تعلقات تو باقی ہیں، ان کو تو نہ چھوڑو۔ وَإِنْ أَرَدُتُمْ أَنْ تَسْتَرْضِعُوا أَوْلَادَكُمْ (2:233) اور اگر یہ صورت ہو کہ یہ دودھ پلانا نہیں چاہتی اس کے ہاں دودھ نہیں ہے۔ کسی اور جگہ سے دودھ پلانے کا کوئی اور انتظام کرنا چاہتے ہو، فَلَا جُنَاحَ عَلَيْكُمْ (2:233) تو اس میں بھی کوئی حرج نہیں ہے۔ إِذَا سَلَّمَتُمْ مَّا آتَيْتُمْ بِالْمَعْرُوفِ (2:233) بس اتنی سی بات ہے جو اس سے طے ہوا تھا، اس کو پورے کا پورا چکا دو، دوسری جگہ انتظام کرو۔ کتنے صاف احکام ہیں، کتنے سہل احکام ہیں، جو دیے چلے جا رہے ہیں۔ کہا کہ وَاتَّقُوا اللَّهَ (2:233) بات یہ ہے کہ قوانین خداوندی کی نگہداشت کرنی ہے۔ یہاں فارم کا تعلق نہیں ہے، طریق کا سوال نہیں ہے۔ طریق جو بھی ایسا ہو، جس میں یہ مقصد پورا ہوتا ہو، میں یہ کر دو۔ مقصود قانون خداوندی کی نگہداشت ہے۔

قانون کی پابندی کرنے کا تمام تردار و مدار اس بنیاد پر ہے کہ

اسے خدا کا قانونِ مکافاتِ عمل کے مطابق نتیجہ مل رہا ہے

اور بات آخر میں وہی ہے برادران عزیز! جس بنیاد پر یہ قانون کی پابندی کی عمارت استوار ہوتی ہے۔ وَاعْلَمُوا أَنَّ اللَّهَ يَمْتَأْتَعُمُ لَوْنَ بَصِيرَةً (2:233) ہر وقت خیال یہ رہے ہے، نہیں کہ پولیس میں دیکھ رہا ہے یا نہیں، اس سے قانون کا احترام نہیں پیدا ہوتا۔

پاکستان کا ونڈ چین میں: یہاں چوری نہیں ہوتی لہذا تلاہی نہیں ہوتا:

عزیزانِ من! ایمان یہ ہے کہ خداد یکھ رہا ہے۔ بس یہ ہے عزیزانِ من! مومن اور کافر کے اندر حد امتیاز یہ ہے۔ ورنہ پولیس میں (Policeman) کے ماتحت تو قانون کی پابندی کافروں کی قومیں ایسی کر رہی ہیں کہ اس پر ہم رشک کر رہے ہیں۔ ہمارے ہی ہاں کا ونڈ چین میں گیا تھا۔ ہٹل سے باہر نکلنے لگا تو ان سے کہا کہ صاحب! تلا لگائیے۔ انہوں نے کہا کا ہے کہ

لیے؟ کہا کہ میں باہر جا رہا ہوں، اپنے کمرے میں تالا لگاؤں گا۔ کہنے لگے کہا ہے کے لیے؟ اب یہ بیچارے کا ہے کے لیے، کیا سمجھیں۔ یہاں بھی کسی سے کسی نے پوچھا ہے کہ تالا کا ہے کے لیے؟ اس نے کہا کہ صاحب! اندر میری چیزیں ہیں۔ کہنے لگے ٹھیک ہے پھر کیا ہوا۔ کہنے لگے: جی! وہ کہیں چوری نہ ہو جائے۔ کہنے لگے: آپ کہاں کی باتیں کر رہے ہیں، کس ملک میں آپ آئے ہوئے ہیں؟ ہمارے ملک میں تالا نہیں ہوتا اس لیے کہ یہاں چوری نہیں ہے۔ یہیں تھا کہ ہوٹل کے ہر دروازے کے اوپر ایک پولیس والا کھڑا تھا۔ پولیس والا بھی ناکام رہ گیا تھا فوجی کھڑا تھا، آج کل تو فوجی کھڑا کرنا پڑتا ہے۔ سارے ملک میں سوائے مملکت کے امور کے جو بغافت، سازشیں وغیرہ انتظام کے ہوتے ہیں پولیس ہی نہیں ہے۔ معاشرے کے انتظام کے لیے پولیس کی ضرورت نہیں پڑ رہی۔ وہ کہتا ہے کہ چوری نہیں ہوتی ہے۔ اس نے کہا کہ میں نے پوچھا کہ چوری کیوں نہیں ہوتی ہے؟

### چوری کا عمل تو میری اور تیری کی تفریق سے پیدا کردہ ہوتا ہے

#### گھر لیوزنڈگی میں چار پائی کی چوری کا کبھی تصور پیدا ہی نہیں ہوتا:

عزیزانِ من! میں کیا بتائیں بتاؤں کہ وہاں چوری ہوتی کیوں نہیں ہے؟ فلاسفہ نہیں ہے، یونہی ترجمان ہے وہ زبان جانتا ہے، کہتا ہے کہ وہ چوری ہوتی ہے کہ تمہاری جو چیز ہے وہ میں لے جاؤں، جہاں چیز کے متعلق قیہ ہے، ہی نہیں کہ وہ تیری ہے یا میری ہے تو چوری کیا۔ میرے اللہ! میں نے کہا تھا عزیزانِ من! کہ سپاہی کے کھڑے ہوتے ہوئے چوری نہ کرنا تو ایک طرف رہا سپاہی کی عدم موجودگی میں بھی چوری نہ کرنا۔ یہ چیزیں تو ان ملکوں نے بھی اپنے ہاں پیدا کر لی ہیں، جو خدا پہ بھی ایمان نہیں رکھتے آختر پہ بھی ایمان نہیں رکھتے۔ ہمارے ہاں کیا چیز اس نے بتائی تھی؟ وہاں بھی اگر آپ کرید کر دیکھیں گے تو وہاں ان کے دل کے اندر بھی ایک آئیڈی یا لوگی ہو گی باطل ہی کی سہی۔ وہ بھی اپنے نتائج پیدا کرتی ہے۔ یہ جو چیز تھی کہ صاحب! چوری تو وہاں ہوتی ہے کہ جو تمہاری چیز ہو، میں لے جاؤں۔ دیکھا آپ نے یہ اصول ہے۔ یہاں کیا اصول ہے جس کے لیے کسی پولیس میں کی ضرورت نہیں پڑتی، تالے کی ضرورت نہیں پڑتی؟ بڑی بات آسان ہے کہ وَاعْلَمُوا أَنَّ اللَّهَ يَعْلَمُ مَا تَعْمَلُونَ بَصِيرٌ<sup>۲۳۳</sup> (2:233) اس چیز کا یقین رکھو کہ جو کچھ تم کر رہے ہو وہ دیکھ رہا ہے۔ جو کر رہے ہو وہی نہیں دیکھ رہا، کہا کہ وہ تمہاری نگاہ کی خیانتوں اور دل کے ارادوں تک سے واقف ہوتا ہے۔ کہاں چلا گیا قرآن! وہاں تو پھر بھی جب نیت یا ارادہ عمل میں آئے تو اس کی گرفت ہوتی ہے۔ کتنی ہی Effeceint آپ کے ہاں جرم کی Detection کیوں نہ ہو۔ جرم کا جب محسوس طور پر ارتکاب ہو جائے اس صورت میں یہ ہے یا ایسا شہبہ پڑ جائے کہ یہ کرے گا۔ دل میں اگر خیالات گزر رہے ہیں دن رات گزرتے چلے جائیں کوئی حرکت ایسی سر زدہ ہو جس سے شبہ پڑے یا آپ ارتکاب جرم نہ کریں گرفت نہیں ہوتی۔ یہاں کیفیت یہ ہے کہ دل میں گزرنے والے خیالات سے بھی وہ واقف ہے اور جو کچھ میرے دل میں گزر رہا ہے، وہ بھی Undetected نہیں رہ سکتا۔ کون پیش کرے گا؟ کہاں پیش کیا جائے گا؟ یہ توجہ آیات آئیں گی تو وہاں سورۃ بنی اسرائیل

میں بتاؤں گا، بات صاف سی کہہ دی ہے۔ پیش کیا مقدمہ، پہلے ہی دن ملزم نے یہ کہہ دیا کہ صاحب! پولیس کی رپورٹ ہے، مجھے اس پر اعتماد نہیں ہے۔ شہادت میں دوسرا آیا، نہیں صاحب! یہ جو گواہ ہے، یہ پھر گیا ہے، دوسروں سے مل گیا ہے۔ ہزار چیزیں ایسی نکلتی ہیں۔ وہ تو اس قسم کی ایک گنجائش ہے جو وہ چنخ<sup>①</sup> اٹھا کر

پکڑے جاتے ہیں فرشتوں کے لکھے پر ناجت  
آدمی کوئی ہمارا دم تحریر بھی تھا

انسان کا اپنا نفس اپنی گواہی آپ ہو گا:

قرآن کہتا ہے کہ تمہارا آدمی نہیں، یہاں تو کفی بِنَفْسِكَ الْيَوْمَ عَلَيْكَ حَسِيبًا<sup>۱۴</sup> (17:14) اس عدالت میں تو خود اپنے خلاف گواہی دے گا۔ کہا جائے گا اقْرُأْ كِتَابَكَ<sup>۱۵</sup> (17:14) یہ ہے تیرا اعمال نامہ، پولیس کا نشیبل یاڈی ایس پی پر اسکیوں نہیں کرے گا اقْرُأْ كِتَابَكَ<sup>۱۶</sup> (17:14) اپنا اعمال نامہ آپ پڑھ۔ عَلَيْكَ حَسِيبًا<sup>۱۷</sup> (17:14) تیری خلاف گواہی دینے والا تیرا اپنا نفس ہے۔ خود اپنے خلاف گواہی دے، اپنا اعمال نامہ آپ پڑھ۔ عزیزانِ من! پوچھا کرتے ہیں کہ صاحب ایمان کا کیا تعلق ہے؟ انسان اگر نیک عمل ہے ایمان پھر کہاں آتا ہے؟ وہ ٹھیک ہے ہمارا جو ایمان ہے وہ تو کہیں آتا نہیں ہے لیکن آپ دیکھتے ہیں کہ ایمان کہاں آتا ہے؟ اس کا ایمان، ایمان ہے۔ یہ لیقین کامل کہ دل میں گزرنے والے خیالات سے بھی وہ واقف ہے اور یہ جو چیز سامنے آئی ہے، میں نے خود اپنے خلاف شہادت دے کر بیڑیاں پہن لیں ہیں۔ ایمان اسے کہتے ہیں اور یہی بنیاد ہے۔

انسانی معاشرے میں امن کا تصور ایمان کے بغیر پیدا نہیں ہو سکتا:

عزیزانِ من! کہایہ ہے کہ وَاتَّقُوا اللَّهَ تَعَالَى همیشہ قانون خداوندی کی نگہداشت کرو اور اس حقیقت کو پیش نظر رکھو کہ آج یا آج سے دس بزرگ سال بعد انسانی معاشرے میں امن اس دن قائم ہونا ہے جس دن یہ ایمان آجانا ہے کہ وَاعْلَمُوا أَنَّ اللَّهَ يَعْلَمُ مَا تَعْمَلُونَ بَصِيرٌ<sup>۱۸</sup> (2:233) خدا کا قانون مکافات تمہارے ہر عمل اور نیت پر نگاہ رکھتا ہے۔ اس لئے نہ تو قانون کی رسی پابندی کرو اور نہ ہی اس سے گریز کی را ہیں تلاش کرو۔

عزیزانِ من! وقت ہو گیا، آیات یہی آگے چل رہی ہیں۔ آج ہم سورۃ بقرۃ کی آیت 233 تک آگئے 234 ویں آیت پھر آئندہ لیں گے۔

رَبَّنَا تَقَبَّلْ مِنَّا إِنَّكَ أَنْتَ السَّمِيعُ الْعَلِيمُ

<sup>①</sup> یہ میرزا اسداللہ خاں غالب (1869-1897) کی طرف اشارہ ہے۔

## روزونک کا مقصود و منتہی

(پونزی صاحبؒ کا ایک درسِ قرآن مجید)

عزیزانِ گرامی قدر! درسِ قرآن کے سلسلہ کے اعتبار سے آج سورہ انمل کی اُنگلی آیت سے سلسلہ کلام شروع ہونا چاہئے تھا لیکن احباب کے تقاضا کے پیش نظر آج کا درس روزہ کے موضوع کے لئے مختص کیا جا رہا ہے۔ میں اس درس میں روزوں کے مسائل کے متعلق بات نہیں کروں گا۔ یہ احکام سورہ بقرہ کی تین چار آیات (183-187:2) میں نہایت جامعیت سے بیان ہوئے ہیں، اس لئے ان کے دہرانے کی ضرورت نہیں۔ ان کے بجائے میں اس امر کی وضاحت کرنا چاہتا ہوں کہ قرآن کریم کی رو سے روزوں کا مقصد کیا ہے؟ ان کی غایت کیا ہے؟ یہ کیوں فرض قرار دیئے گئے ہیں؟

قرآن کریم کی ایک خصوصیت (بلکہ جہاں تک میری نگاہ کام کرتی ہے اس کی انفرادیت) یہ بھی ہے کہ یہ جب کوئی حکم دیتا ہے تو اس کے ساتھ اس کی وضاحت بھی کر دیتا ہے کہ یہ حکم کیوں دیا گیا ہے؟ اس کی غرض و غایت کیا ہے؟ اس پر عمل پیرا ہونے کا نتیجہ کیا ہوگا؟ مثلاً اس قسم کی آیات آپ کوئی ایک مقامات پر ملیں گی:

وَأَنْزَلَ اللّٰهُ عَلَيْكَ الْكِتٰبَ وَالْحُكْمَةَ (4:113)

”اے رسول! اللہ نے تم پر کتاب اور حکمت نازل کی ہے۔“

کتاب کے معنی احکام یا قوانین کے ہیں اور حکمت سے مراد ان احکام و قوانین کی غرض و غایت۔ یہ دونوں منزل من اللہ ہیں۔ احکام کے سلسلے میں یہ انداز، عظیم حکمت بالغ پرمنی ہے۔ اگر کسی کوکی حکم دیا جائے لیکن اس کی غرض و غایت نہ بتائی جائے۔ یعنی اسے یہ نہ بتایا جائے کہ اسے وہ حکم کیوں دیا جا رہا ہے تو وہ اس کی تعمیل طوعاً و کرہا کرے گا، بطیب خاطر نہیں کرے گا۔ مستبد حکومتیں اسی طرح احکام صادر اور نافذ کرتی ہیں۔ لوگ ان پر با مر جبوجوی عمل پیرا ہوتے ہیں اور اسی لئے ان سے گریز کی راہیں تراشتے اور فرار کے طریقے سوچتے رہتے ہیں۔ اگر انہیں بتا دیا جائے کہ ان احکام کی اطاعت سے انہیں کیا حاصل ہوگا۔ اس میں خود ان کے کیا کیا فوائد مضر ہیں تو وہ ان پر دل و دماغ کی کامل رضامندی سے عمل پیرا ہوں گے اور ان سے مخرف ہونے کا خیال تک بھی دل میں نہ لائیں گے۔ کتاب کے ساتھ حکمت کی وضاحت کی پہلی مصلحت یہ ہے۔

دوسرے یہ کہ جب آپ کو بتا دیا جائے کہ اس حکم کی تعمیل کا نتیجہ یہ ہوگا تو آپ قدم قدم پر اس کا جائزہ لیتے جائیں گے کہ

اس حکم کی صحیح معنوں میں تعییل ہو رہی ہے یا نہیں۔ اگر اس حکم کی غایت نہ بتائی جائے تو آپ اس پر بلا سوچ سمجھے مکینی طور پر عمل کرتے رہیں گے اور کبھی یہ نہیں دیکھ سکیں گے کہ اس حکم کی تعییل صحیح طور پر ہو رہی ہے یا نہیں۔ اور اگر آپ نے اپنے ذہن میں فرض کر لیا کہ اس کا نتیجہ یہ برآمد ہو گا تو آپ بڑی غلطی میں بتلا رہیں گے اور ہو سکتا ہے کہ آپ کی ساری محنت رائیگاں چلی جائے۔ مثال کے طور پر یوں سمجھئے کہ ڈاکٹر مریض کے لئے ایک دوائی تجویز کرتا ہے اور کہتا ہے کہ دوائی دینے کے بعد مریض کا ٹمپر پرچر لیتے جائیں۔ ہر گھنٹے کے بعد کم از کم ایک ڈگری بخار کم ہو جائے گا۔ آپ مریض کو دوپلاٹے ہیں اور ڈاکٹر کی ہدایت کے مطابق اس کا ٹمپر پرچر لیتے ہیں۔ اگر بخار کم ہو رہا ہے تو آپ کو اطمینان ہو گا اور آپ علاج جاری رکھیں گے لیکن اگر آپ دیکھیں کہ بخار کم نہیں ہو رہا تو آپ کواز سرنو جائزہ لینا ہو گا کہ یا تو مرض کی تشخیص صحیح نہیں ہوئی یا دوائی ٹھیک نہیں ملی اور یا اس کی استعمال میں آپ سے کوئی غلطی ہوئی ہے۔ یہ نہیں ہو گا کہ ڈاکٹر کے کہنے کے مطابق نتیجہ برآمد نہ ہو اور آپ بدستور وہی دوائی دیتے چلے جائیں۔ اگر آپ ایسا کرتے ہیں تو اس کا جو نتیجہ بکل سکتا ہے ظاہر ہے۔ اللہ تعالیٰ نے جہاں کوئی حکم دیا ہے اس کے ساتھ ہی یہ بھی بتا دیا ہے کہ اس پر عمل پیرا ہونے سے نتیجہ کیا نکلے گا۔ اگر اس کا وہ نتیجہ برآمد نہیں ہوتا تو آپ کو رکرسوچنا ہو گا کہ اس حکم کی تعییل میں آپ سے کیا غلطی ہو گئی ہے۔ اس سے نہ صرف یہ کہ آپ کی محنت رائیگاں نہیں جائے گی بلکہ اس حکم کی غلط تعییل کے نقصانات سے بھی آپ محفوظ رہیں گے۔

قرآن کریم میں اللہ تعالیٰ نے فرمایا کہ **كُتِبَ عَلَيْكُمُ الصِّيَامُ** (183:2)۔ ”اے جماعتِ مومنین! تم پر صیام فرض قرار دیئے گئے ہیں۔ یہ ”کتاب“ یعنی حکم ہے۔ اس کی غایات کے متعلق کہا:

**لَعَلَّكُمْ تَتَّقُونَ** (183:2) **وَلَعَلَّكُمْ تَشْكُرُونَ** (185:2) اور **وَلِشُكْرِيْوَا اللَّهَ عَلَى مَا هَدَيْكُمْ** (185:2)

تَتَّقُونَ (۱۸۳) سے مراد یہ ہے کہ تم میں قوانین خداوندی کی اطاعت کے لئے پختگی پیدا ہو جائے اور تم غلط را ہوں پر چلنے کے نقصانات سے محفوظ ہو جاؤ۔ تَشْكُرُونَ (۱۸۵) سے مقصود یہ ہے کہ تمہاری محنتیں بھر پور نتائج پیدا کر دیں۔ میں ان دو غایات کے متعلق سرِ دست تفصیل میں نہیں جاؤں گا۔ قرآن کریم نے جو غایت الغایات بتائی ہے اس پر مرکوز رہوں گا اور وہ غاییۃ الغایات یہ ہے کہ تم خدا کے بتائے ہوئے پروگرام پر عمل کرنے سے اس قابل ہو جاؤ گے کہ دنیا میں خدا کی کبریائی قائم کر سکو۔ یہ ہے روزوں کے متعلق حکم خداوندی کا مقصود و منتہی۔ یعنی خدا کی کبریائی قائم کرنے کے قابل ہو جانا:

**وَلِشُكْرِيْوَا اللَّهَ عَلَى مَا هَدَيْكُمْ** (185:2)

سب سے پہلے لفظ ”کبریائی“ کو لیجئے۔ اس کے معنی حکومت اور اقتدار کے ہیں۔ سورہ یونس میں ہے کہ جب حضرت موسیٰ علیہ السلام اور ان کے بھائی حضرت ہارون علیہ السلام فرعون کے پاس گئے اور اس تک خدا کا پیغام پہنچایا تو اہل فرعون نے کہا کہ تم جو کچھ کہہ رہے ہو تم اس کی غرض و غایت کو خوب پہچانتے ہیں۔ یعنی یہ کہ: **وَتَكُونُ لَكُمَا الْكِبْرِيَاءُ فِي الْأَرْضِ** (10:78) ”تمہارا مقصد یہ ہے کہ اس ملک میں حکومت تمہاری قائم ہو جائے۔ اقتدار تمہارے ہاتھ میں آ جائے“۔ اس

سے لفظ ”کبریائی“ کا مفہوم واضح ہو جاتا ہے۔

جہاں تک خارجی کائنات کا تعلق ہے اس میں خدا کا اقتدار اور اس کی حکمرانی براہ راست قائم ہے۔ تمام کارگہ کائنات اسی کے قوانین کے مطابق سرگرم عمل ہے اور اس میں کسی شے کو مجالِ انحراف نہیں یا رائے سرشنی نہیں: وَلَهُ الْكَبِيرُ يَأْمُرُ فِي السَّمَاوَاتِ وَالْأَرْضِ وَهُوَ الْعَزِيزُ الْحَكِيمُ (45:37) ”کائنات کی پستیوں اور بلندیوں میں کبریائی خدا کی ہے۔ وہ زبردست غلبہ کا مالک ہے لیکن اس کا غلبہ مستبد حکمرانوں کا غلبہ نہیں۔ وہ سراسر حکمت پر منی ہے۔“ دوسری جگہ ہے: وَهُوَ الَّذِي فِي السَّمَاوَاتِ وَفِي الْأَرْضِ إِلَهٌ (43:84) ”وہی آسمانوں میں بھی صاحب اقتدار ہے اور وہی ارض پر بھی صاحب اقتدار۔“ (الله کے معنی صاحب اقتدار کے ہیں)۔

خارجی کائنات میں تو خدا کا اقتدار از خود قائم ہے۔ لیکن اس کی مشیت کا پروگرام یہ ہے کہ انسانوں کی دنیا میں اس کی کبریائی از خود انسانوں کے ہاتھوں قائم ہو۔ اسی مقصد کے لئے رسول صحیحے جاتے تھے اور رسول کے بعد اس کی ذمہ داری اس کی امت پر عائد ہوتی تھی۔ چنانچہ جب نبی اکرم ﷺ کو منصبِ نبوت پر سفر فراز فرمایا گیا تو آپ کو حکم دیا گیا کہ: يَا أَيُّهَا الْمُدَّثِّرُ ”اے وہ کہ جس کی آمد سے خزان دیدہ گلشن کائنات بہارِ نو کا مظہر بن جائے گا۔ (الْمُدَّثِّرُ کے یہی معنی ہیں)۔ قُمْ فَأَنْذِرْ ”اٹھ اور نوع انسان کو ان کے اپنے وضع کردہ نظام ہائے حیات کی تباہ کاریوں سے آگاہ کر دے۔“ وَرَبَّكَ فَكِيرْ (2:74) ”اور ان نظاموں کی جگہ اس نظام کو قائم کر جس میں کبریائی صرف خدا کے لئے ہو۔“ یہ تھا منصبِ رسالت۔

دوسرے مقام پر اسی حقیقت کو جن الفاظ میں بیان کیا گیا ہے ان کی تفصیل بڑی وسعت چاہتی ہے لیکن میں ان میں سے صرف دو کلموں کو نمایاں طور پر سامنے لاوں گا۔ وَلَمْ يَكُنْ لَّهُ شَرِيكٌ فِي الْمُلْكِ ”حکومت صرف اسی کے لئے مختص ہے۔ اس میں کوئی دوسرا شریک نہیں ہو سکتا۔“ اور اس سے آگے ہے: وَ كَيْزَرُهُ تَكْبِيرًا (17:111) ”لہذا تم اس کی کبریائی قائم کر دے۔“ اسی اعتبار سے خدا نے اپنے آپ کو ایک جگہ: الْمُتَكَبِّرُ (59:23) کہا ہے۔ کہیں الْكَبِيرُ الْمُتَعَالُ (13:9) اور کہیں: الْعَلِيُّ الْكَبِيرُ (22:62) ۔ ہماری دنیا میں وہ الْعَلِيُّ الْكَبِيرُ کیسے قرار پاتا ہے اس کی وضاحت اس نے یہ کہہ کر دی کہ: فَالْحُكْمُ لِلَّهِ الْعَلِيِّ الْكَبِيرِ (40:12) تمہاری دنیا میں حکم صرف اس خدا کا چلنا چاہئے جو ہر قسم کے غلبہ اور کبریائی کا مالک ہے۔

اس سے یہ سوال پیدا ہوتا ہے کہ خدا نہ تو ہمارے سامنے آتا ہے۔ نہ وہ تخت حکومت پر بیٹھتا ہے۔ نہ ہم اس کی آواز سنتے ہیں۔ تو ہمارے معاشرے میں اس کی حکومت کیسے قائم ہوگی؟ اس کے لئے اس نے خود ہی بتادیا کہ۔۔۔ اس نے ہماری طرف اپنا ضابطہ احکام بھیج دیا ہے۔ جو حکومت اس ضابطے کے مطابق قائم ہوگی اسے خدا کی حکومت سے تعمیر کیا جائے گا۔ چنانچہ اس نے واضح الفاظ میں بتادیا کہ:

وَمَنْ لَّهُ يَحْكُمْ إِمَّا أَنْزَلَ اللَّهُ فَأُولَئِكَ هُمُ الْكُفَّارُونَ (5:44)  
جو لوگ خدا کی کتاب کے مطابق حکومت قائم نہیں کرتے ان ہی کو کافر کہا جاتا ہے۔



لیکن خدا کی یہ کبریائی یونہی بیٹھے بھائے وعظ و نصیحت یا تقاریر و خطابات سے قائم نہیں ہو جاتی۔ جب اس کا مقصد دنیا کے ہر نظام کو الٹ کر اس کی جگہ نظام خداوندی کو ممکن کرنا ہے تو ظاہر ہے کہ دنیا کی ہر قوم اور ہر حکومت کی طرف سے اس کی مخالفت ہو گی اور ہر مفاد پرست گروہ اس کی مراجحت کرے گا۔۔۔ ان مخالفتوں اور مراجحتوں کے مقابلے کے لئے میدان جنگ تک میں بھی جانا پڑے گا۔ چنانچہ قرآن کریم میں جماعتِ مومنین کی ان جنگوں کی غایت یہ بتائی گئی ہے:

وَجَعَلَ كَلِمَةَ الدِّينِ كَفَرُوا السُّفْلَىٰ وَكَلِمَةُ اللَّهِ هِيَ الْعُلِيَاٰ (9:40)

اس سے مقصد یہ ہے کہ ہر غیر خداوندی نظام مغلوب ہو جائے اور خدا کا نظام جسے غالب ہونے کا حق حاصل ہے، عملًا مسلط ہو جائے۔

اس سے چند ہی آیات پہلے کہا گیا ہے:

هُوَ الَّذِي أَرْسَلَ رَسُولَهُ إِلَيْهِدِي وَدِينِ الْحَقِّ لِيُظْهِرَهُ عَلَى الَّذِينَ كُلَّهُ لَا وَلُوْ كَرَّةَ الْمُشَرِّكُونَ (9:33)  
خدا وہ ہے جس نے اپنے رسول کو ضابطہ ہدایت اور حق پر مبنی نظام دے کر بھیجا تا کہ یہ نظام انسانوں کے ہر خود ساختہ نظام پر غالب آجائے۔ خواہ یہ تبدیلی ان لوگوں پر گراں کیوں نہ گزرے جو خالص حکومت خداوندی قائم نہیں کرنا چاہتے۔  
یہاں صرف اتنا کہا گیا ہے کہ اس نے رسول کو اس مقصد کے لئے بھیجا۔ لیکن دیگر مقامات پر اس کی وضاحت کر دی کہ نظام خداوندی کا قیام تھا رسول کے ہاتھوں سے عمل میں نہیں آئے گا۔ اس کے لئے جماعتِ مومنین کی معاونت و رفاقت بھی ضروری ہو گی۔ یعنی یہ فریضہ **فَرَبِّ الْمُحَمَّدَ رَسُولُ اللَّهِ وَالَّذِينَ مَعَهُ** (48:29) کے ہاتھوں سرانجام پائے گا۔

اللہ تعالیٰ نے الاعلیٰ اپنے آپ کو کہا تھا لیکن جس جماعتِ مومنین کے ہاتھوں اس کی کبریائی دنیا میں قائم ہوتی ہے۔ اس نے انہیں الْأَعْلَوْنَ کہہ کر پکارا ہے۔ چنانچہ اس نے فرمایا: وَأَنْثُمُ الْأَعْلَوْنَ إِنْ كُنْتُمْ مُّؤْمِنِينَ (3:138)  
”اگر تم مومن ہو اور مومن رہو گے تو دنیا میں تم ہی سب پر غالب رہو گے۔“ تمہارا قائم کردہ نظام انسانوں کے ہر خود ساختہ نظام پر غالب آجائے گا۔ اس غلبہ و سلط کے لئے قرآن کریم نے ان کُنْتُمْ مُّؤْمِنِينَ کی شرط عائد کر دی ہے۔ ”یعنی اگر تم مومن ہوئے تو،“ یہاں یہ سوال پیدا ہوتا ہے کہ یہ کیسے معلوم ہو کہ ہم مومن ہیں یا نہیں؟ اس کے لئے قرآن نے خود یہ واضح کر دیا کہ جو لوگ خدا کی کتاب کے مطابق حکومت قائم نہیں کرتے وہ مومن نہیں، کافر ہیں لہذا مومن وہ ہیں جو خدا کی کتاب کے مطابق حکومت قائم کرتے ہیں اور اس کی محسوس نشانی یہ ہے کہ وہ دنیا کی ہر قوم پر غالب رہتے ہیں۔ چنانچہ اس نے واضح طور پر کہہ دیا

کہ

وَلَنْ يَجْعَلَ اللَّهُ لِلْكُفَّارِيْنَ عَلَى الْمُؤْمِنِيْنَ سَبِيْلًا (4:141)۔

خدا کبھی ایسا نہیں ہونے دے گا کہ غیر خداوندی نظام کی حامل قوم کو جماعتِ مؤمنین پر غالب آنے دے۔  
لہذا یہ متعین کرنا بالکل آسان ہو گیا کہ ہم مؤمن ہیں یا نہیں؟

یہاں ایک عظیم نتہہ سامنے آتا ہے۔ خدا مؤمنین سے کہتا ہے کہ: آنثُمُ الْأَعْلَوْنَ۔ لیکن مؤمن اس کی عطا کردہ اس سرفرازی کے جذبہ تشكیر کے احساس سے بے سانتہ اپنا سرزی میں پر کھو دیتا ہے اور انہتائی انساری اور خاکساری کے عالم میں کہتا ہے کہ الاعلیٰ میں نہیں۔ سبحان ربی الاعلیٰ۔ الاعلیٰ کے شایان شان صرف تیری ذات ہے۔ یہ تو تیری عاجز نواز یاں ہیں، جو نہیں الاعلَوْنَ کہہ کر پکارا گیا ہے۔ یہ علومرتبت ہماری ذاتی نہیں، تیری عطا فرمودہ ہے۔ اگر ہمارا سر تیرے سامنے نہیں جھکتا تو یہ ساری کبریائی جو نہیں حاصل ہوئی ہے فرعون کی قہر مانیت ہے، مؤمن کی علوشان نہیں۔ اسی بنا پر قرآن کریم نے حق پر بنی کبریائی اور باطل پر بنی کبریائی میں فرق کر کے بتا دیا جب کہا:

سَاضِرِ فَعَنِ اِيْتَقَنَ يَتَكَبَّرُوْنَ فِي الْأَرْضِ بِغَيْرِ الْحَقِّ (7:146)

جو لوگ الحق کے بغیر میں میں غلبہ اور کبریائی حاصل کر لیتے ہیں، ہم اپنے قوانین کی رو سے انہیں اس مقام سے ہٹا دیں گے اور ان کی جگہ وہ قوم لے لے گی جس کی کبریائی الحق پر بنی ہوگی۔

ان تصریحات سے واضح ہو گیا کہ روزوں کی غرض و غایت اور مقصد و منہج کیا تھا؟ ان کا مقصد جماعتِ مؤمنین کو اس کے لئے تیار کرنا تھا کہ وہ دنیا میں خدا کی کبریائی ممکن کر سکیں۔ لتكبرو اللہ علی ما هذ کم۔ صدر اول کی جماعتِ مؤمنین تیرہ برس تک مکہ کی زندگی گزارنے کے بعد مدینہ میں آئی تاکہ یہاں کی نسبتاً مساعد فضا میں نظام خداوندی کی بنیاد رکھ دی جائے، لیکن مخالفین نے انہیں یہاں بھی چین سے نہ بیٹھنے دیا اور مدینہ پر حملہ کی تیاریاں شروع کر دیں۔ یہ تھا وہ مقام جب پہلی مرتبہ (2ھ میں) روزے فرض ہوئے اور ابھی سترہ دن کے روزے ہی رکھے گئے تھے کہ انہیں بدر کے میدان میں اترنا پڑا اور وہاں ان روزہ داروں نے خدا کی کبریائی کی پہلی اینٹ رکھ دی۔ آپ نے غور فرمایا کہ روزوں کی غایت کیا تھی؟۔۔۔ لتكبرو اللہ علی ما هذ کم۔ خدا کے پروگرام کے مطابق ملک میں اس کی کبریائی قائم کرنا۔ اس زمانے میں مستقل فوج (Standing Army) ہنزو وجود میں نہیں آئی تھی۔ قرآن مجید نے تمام مؤمنین کو مجاہدین (فوج کے سپاہی) قرار دیا تھا۔ ایسا نظر آتا ہے کہ جس طرح آج کل مستقل فوج سے الگ۔۔۔ (Reservists) ہوتے ہیں۔ وہ اپنا اپنا کاروبار کرتے رہتے ہیں لیکن انہیں سال میں ایک آدھ ماہ کے لئے بلا یا جاتا ہے تاکہ وہ فوجی ٹریننگ کی تجدید کر لیں اور بوقتِ ضرورت فوج کے ہدوش میدان جنگ میں نبرد آزمائوں۔ خدا کی کبریائی کا تکمیل مؤمن مجاہدین کا فریضہ تھا۔ معلوم ہوتا ہے کہ رمضان کا مہینہ انہیں سپاہیانہ زندگی کا خوگر بنانے کے لئے مختص کر دیا گیا تھا۔ حضور نبی اکرم ﷺ سے جب سوال کیا گیا کہ مؤمن کی زندگی کیا ہے؟ تو فرمایا کہ جب جنگ ہو رہی ہو تو وہ میدان جنگ میں ہو اور جب جنگ نہ ہو رہی ہو تو وہ جنگ کی تیاریوں میں مصروف ہو۔

آپ نے دیکھا کہ مومن کی زندگی کا مقصد و منہج دنیا میں خدا کی کبریائی کو متمکن کرنا ہے اور یہی مقصد روزوں کا بتایا گیا ہے۔ اس کے لئے رمضان کے مہینے کی تخصیص کیوں کی گئی اسے خود خدا نے یہ کہہ کر واضح کر دیا کہ: شَهْرُ رَمَضَانَ الَّذِي أُنْزِلَ فِيهِ الْقُرْآنُ (185: 2) ”رمضان کا مہینہ وہ ہے جس میں نزول قرآن کی ابتداء ہوئی۔“ قرآن کریم کو اللہ تعالیٰ نے نوع انسان کے لئے نعمت عظیمی کے قرار دیا ہی اور ان سے کہا ہے کہ تم ایسی عظیم میتاع کے ملنے پر جشن سرت مناؤ۔

**قُلْ بِفَضْلِ اللَّهِ وَبِرَحْمَتِهِ فَبِذِلِكَ فَلِيُفْرُحُوا هُوَ خَيْرٌ لِّهُمْ مَعُونَ (10: 58)**

اے رسول! ان سے کہہ دو کہ تمہیں یہ میتاع گراں بہا بلا مزدوم معاوضہ مل گئی ہے۔ اس کے ملنے پر تم جشن مناؤ۔ تم جو کچھ بھی دنیا میں جمع کرو یہ اس سے زیادہ گراں تدر ہے۔

لہذا جسے عید الفطر کہا جاتا ہے وہ درحقیقت جشن نزول قرآن ہے۔ قرآن، خدا کی کبریائی کا ضابطہ ہدایت ہے اور رمضان کے مہینے کے روزے مجاہدین کو خدا کی کبریائی قائم کرنے اور مستحکم رکھنے کا پروگرام۔ اس پروگرام کے بخیر و خوبی انجام پانے پر جشن سرت بالکل فطری عمل ہے۔

یہ تھا دین میں روزوں کا مقصد۔ یعنی لتكبرو اللہ علی ما هد کم۔ تاکہ زمین پر خدا کی حکومت قائم کی جائے لیکن جب دین مذہب میں تبدل ہو گیا تو قرآن کریم کے یہ الفاظ توباتی رہ گئے لیکن ان کی غرض و غایت بالکل بدل گئی۔ آپ قرآن کریم کا کوئی سا با ترجمہ نہجا اٹھا کر دیکھیں۔ اس میں ان آیات کا ترجمہ ان الفاظ میں ملے گا۔ ”تاکہ تم خدا کی بڑائی کرو۔“ یعنی دین میں ان الفاظ کا مفہوم خدا کی کبریائی قائم کرنا تھا۔ مذہب میں ان کا مطلب خدا کی بڑائی بیان کرنارہ گیا۔ کبریائی قائم کرنے اور بڑائی بیان کرنے میں جو فرق ہے وہ واضح ہے۔ اس ”بڑائی بیان کرنے“ کے حکم کی اطاعت کے متعلق کہا گیا کہ نماز عید میں جو چھتیکریں زائد کہی جاتی ہیں، ان سے اس حکم کی تعییں ہو جاتی ہے۔ اذان۔ نماز اور عیدین کی تکبیریں اپنی اپنی جگہ ججا اور درست، لیکن یہ تکبیریں ایک بلند مقصد کے حصول کا ذریعہ یا ایک واقعہ کا اعلان تھیں۔ یعنی اس واقعہ کا اعلان کہ یہاں خدا کی کبریائی قائم ہے۔ اس حقیقت کے وقوع پذیر ہوئے بغیر اس قسم کے اعلانات صرف چند الفاظ کا اعادہ ہیں۔ حقیقت اور اس کی رسمی ادائیگی کا یہی وہ فرق تھا جس کے احساس سے اقبال کے دردمند دل نے با صد آہ و فغافل کہا تھا کہ

الفاظ و معانی میں تقاضت نہیں لیکن ملا کی اذان اور مجاہد کی اذان اور!

پرواز ہے دونوں کی اسی ایک جہاں میں کر گس کا جہاں اور ہے شاہیں کا جہاں اور

یہ مجاہد کی اذان تھی جو دن میں متعدد بار چھت اور مینارہ پر کھڑے ہو کر دنیا میں اعلان کرتی تھی کہ

الله اکبر

کبریائی صرف خدا کے لئے ہی مختص ہے۔ اس میں کوئی اور شریک نہیں ہو سکتا اور اس کے بعد وہ اعلان کرتا تھا کہ

اشهدان لا اله الا الله

میرا یہ اعلان اس حقیقت کی شہادت دیتا ہے کہ خدا کے سوا کوئی صاحب اقتدار نہیں۔ آپ نے کبھی اس پر بھی غور فرمایا کہ اس اعلان میں یہ نہیں کہا گیا کہ میں اس بات کا اقرار کرتا ہوں یا اعلان کرتا ہوں۔ کہا یہ گیا کہ میں اس حقیقت کی ”شہادت دیتا ہوں“۔ شہادت اسی کی قابل قبول ہوتی ہے جسے اس بات کا ذاتی طور پر علم ہو۔ جو اس کا عینی شاہد ہو۔ اگر کوئی شخص عدالت میں جا کر یہ کہے کہ مجھے اس واقعہ کا ذاتی طور پر علم نہیں۔ میرا خیال یہ ہے یا میں نے ایسا سنا ہے تو اس کی شہادت کا قابل قبول ہونا تو درکنار، اسے درخوبی ساعت بھی نہیں سمجھا جاتا۔ لہذا اشہدان لا الہ اسی کا قابل قبول ہو گا جو یہ کہے کہ میں اس کا گواہ ہوں کہ یہاں خدا کے سوا کوئی صاحب اقتدار نہیں۔ یہاں حکمرانی صرف خدا کی ہے۔ جو اس حقیقت کا شاہد نہیں اسے اشہدان لا الہ الا الله کہنے کا حق حاصل نہیں۔ یہی وہ شہادت ہے جس کے متعلق خود اللہ تعالیٰ نے فرمادیا کہ شہد اللہ انہ لا الہ الا ہو۔ ”خد اس کی شہادت دیتا ہے کہ اس کے سوا کوئی صاحب اقتدار نہیں ہے۔“ **وَالْمُلِكُ** ”اور ملکہ جو اس کے اقتدار کو بروئے کار لانے کے لئے مامور ہیں وہ بھی اس کی شہادت دیتے ہیں۔“ - نہیں بھی اس کا حق حاصل ہے کہ وہ بھی اس کی شہادت دیں، کیونکہ وہ اس کے عینی شاہد ہیں۔ اس کے بعد ہے: **وَأُولُو الْعِلْمِ قَلِيلًا يَالْقَسِطِ** - ”ان کے علاوہ وہ لوگ بھی اس کی شہادت دے سکتے ہیں جنہیں اس کا علم بھی حاصل ہے اور پھر وہ ایسا نظام متسلک کرنے ہوئے ہیں جس میں خدا کی میزان عدل قائم ہے۔ یہ لوگ ہیں جو اپنے ذاتی علم اور مشاہدہ کی بناء پر یہ کہہ سکتے ہیں کہ: **لَا إِلَهَ إِلَّا هُوَ الْعَزِيزُ الْحَكِيمُ** (18:3) ”خدا کے سوا کوئی صاحب اقتدار نہیں اور اس کا اقتدار تہا قوت پر نہیں بلکہ قوت کے ساتھ حکمت پر مبنی ہے۔“

آپ نے غور فرمایا کہ۔۔۔ قرآن کریم کی رو سے اللہ اکبر کہنے کا حق کے حاصل ہے؟ رمضان کے روزے جماعتِ مومنین کو اس قابل بنادینے کے لئے تھے کہ وہ ملک میں خدا کی کبریائی قائم کریں اور پھر ساری دنیا کے سامنے اس کی شہادت دے سکیں۔ یہ ہے عزیزان میں میری قرآنی بصیرت کے مطالب صیام کی غرض و غایت اور رمضان کا مقصد و منظی۔

**رَبَّنَا تَقَبَّلْ مِنَّا طَإَنَّكَ أَنْتَ السَّمِيعُ الْعَلِيُّم** (2:127)

### تصحیح

فروری 2024ء کے طلوعِ اسلام کے لمعات میں کچھ فروگذاشتوں کی طرف محترم شیخ اللہ تاصاحب نے توجہ دلائی ہے جو کہ درج ذیل ہیں:

(1) پرویز علیہ الرحمہ کسی دور میں بھی ماہنامہ طلوعِ اسلام کے مدیر نہیں رہے۔ (2) قائد اعظم نے پرویز صاحب کو وزارت کی پیش کش نہیں کی تھی بلکہ کہا تھا کہ جو عہدہ آپ لینا چاہیں لے سکتے ہیں۔ (3) پرویز صاحب کا درس قرآن صرف جمعہ کو نہیں ہوا کرتا تھا بلکہ ہفتہ وار تعطیل جس دن ہوتی اس دن منعقد ہوا کرتا تھا۔

بِسْمِ اللّٰهِ الرَّحْمٰنِ الرَّحِيْمِ

(گذشتہ سے پیوستہ)

لے گئے تثبیت کے فرنڈ میراث خلیل ع

# فَلَسْطِينُ مُحَسْرَّتَانِ میں

(نوشہ 1967ء)

یہودی استحقاق کی دوسری وجہ ہی ہے۔ حضرات موتیٰ علیاً اور عیسیٰ علیہ السلام فلسطین کے پیغمبر تھے اور یہودی، اول الذکر کو اپنا قومی ہیر و تصور کرتے ہیں۔ یروشلم یہودیوں کا مذہبی مرکز ہے۔ یہ دلیل دیتے وقت اس میں حقیقت کو فراموش نہیں کیا جاسکتا کہ خود عربوں کے لئے فلسطین اتنا ہی تقدس کا حامل ہے جتنا یہودیوں کے لئے۔ وہ پیغمبر ہمہ نہیں یہودی اپنا سمجھتے ہیں درحقیقت اسلام (الہذا مسلمانوں) کے پیغمبر ہیں۔ مسلمان ان پیغمبروں کا احترام ہی نہیں کرتے ان پر ایمان رکھتے ہیں۔ ان کے نزدیک بھی اس خاک کا ذرہ ذرہ مقدس ہے کہ وہ عروج وزوال اقوام کی الہی مشیت کے پروگرام کا آئینہ بردار ہے اور ایمان و عمل کی بنے نظری تجربہ گاہ۔ مسلمان کی تاریخ فلسطین کے بغیر نامکمل ہے۔ مسلمان ہونے کے اس رشتہ عزیز کو ہمیشہ سینے سے لگائے رکھا اور اسے جان سے عزیز تر کھا، اب وہ اسے ہاتھ سے کیسے جانے دے سکتا ہے؟ یہودی اس رشتہ کو دوہزار سال سے گم کر چکا ہے۔ وہ اسے ہاتھ میں لے سکتا ہے تو مسلمان کا سینہ چیر کر۔ تاریخ شاہد ہے کہ جن مقامات پر مسلمان کا سینہ دوئیم ہوا ہے وہ تاریخ کے فیصلہ کن مقامات تھے۔ آج ہم پھر ایسے ہی فیصلہ کن مقام پر ہیں۔ زندہ قوموں کا ہر مرحلہ ہوتا ہی فیصلہ کن ہے!

عرب:

یہودی تاریخ کے سرسری جائزہ سے ان کا دعویٰ باطل ہو جاتا ہے۔ الہذا عربوں کی تاریخ دھرا نے کا یہ موقع نہیں۔ یوں بھی عربی تاریخ ایسا گم شدہ باب نہیں جسے کوشش سے نمایاں کیا جائے۔ البتہ رابطہ قائم کرنے کے لئے ہم مختصر آتا ہے ابواب پر طائرانہ نگاہ ڈالتے ہیں۔ ترکوں کے دور حکومت میں عالم عرب پر عمومی طور پر جمود چھا گیا۔ ان کے بیداری کے آثار 1747ء سے شروع ہوتے ہیں جب اس تحریک کی داغ بیل ڈالی گئی جسے وہابی تحریک سے موسم کیا جاتا ہے۔ اس تحریک کا آغاز عرب سے محمد ابن عبدالوهاب نے کیا جس کا مقصد اسلام کو ان آلاتشوں سے پاک کرنا تھا جو دمشق اور بغداد میں اس کا لازمہ بن چکی تھیں۔ چونکہ ترکی حکومت عربوں کے لئے سیاسی غلامی کا باعث سمجھی یا سمجھائی جانے لگی تھی، اس لئے بتدریج ان میں آزادی خواہی کے جذبات پیدا ہوتے گئے۔ وہابی جیسی اصلاحی تحریک نے بیداری کے آثار پیدا کئے تو سیاسی غلامی نے ان کا رُخ سیاست کی طرف ہی پھیر دیا۔ 1875ء میں پانچ نوجوانوں نے مل کر بیروت میں ایک خفیہ سیاسی انجمن کی

طرح ڈالی۔ ایسی خفیہ انجمنوں کی سرگرمیاں آہستہ آہستہ ترکی کے خلاف بھی ہوتی گئیں۔

انیسویں صدی کے نصف آخر میں یورپی اقوام، زندگی کی فن تریپ محسوس کر رہی تھیں۔ ان کے فکری ارتقاء میں مادیت کو دخل تھا اور کئی ایک فاسنی و حشیانہ قوت کے علمبردار تھے۔ چنانچہ اقوام یورپ قومی تغلب کے نشہ میں بدمست ہو کر دنیا کے مختلف خطوں میں اپنے اپنے وقار کے لئے دوڑ دھوپ کر رہی تھیں۔ 1860ء میں دمشق اور لبنان میں مسلم، عیسائی فسادات ہوئے جن میں عیسائیوں کو نقصان اٹھانا پڑا۔ ان فسادات کو بہانہ بن کر نام نہاد عیسائی سلطنتوں نے مشرق وسطیٰ کے امور میں دخیل ہونا شروع کر دیا۔ یورپی قومی کی یہ مداخلت بذریعت بڑھتی گئی اور غیر یورپی مالک ان کی باہمی رقبتوں کی آماجگاہ بن گئے۔ برطانیہ بر صغیر پر قابض تھا، وہ انگلستان سے بر صغیر تک کارستہ محفوظ کرنا چاہتا تھا۔ بحر روم اور بحر قلزم کے سواحل اس کے لئے مخصوص فوجی اہمیت رکھتے تھے۔ چنانچہ اس نے 1882ء میں مصر اور سوڈان پر قبضہ کر لیا۔ فرانس نے الجیریا (1830) اور ٹیونس (1881ء) پر قبضہ کر لیا۔ جرمنی نے بھی مشرق وسطیٰ پر لچائی ہوئی نگاہیں ڈالنا شروع کر دیں۔ بیسویں صدی کے آغاز میں اٹلیٰ نے بحر روم کو رومنی جھیل بنانے کے قصد سے لبیا کی رگ جان میں اپنے خونی پخ گاڑ دیئے یہ سلسلہ جنگِ عالمگیر تک جاری رہا اور مالکِ اسلامیہ استعمارِ فرنگ کا یا براہ راست شکار ہو گئے یا بالواسطہ اس کے زیر اثر آگئے۔

اندر وطنی خرایوں اور بدنظریوں اور مغربی قوائے کی ریشہ دو ایوں کے طفیل ترکی، مردیبار بن چکا تھا۔ ترکی اب تک خلافتِ اسلامیہ کا حامل تھا۔ اس کے دم سے بظاہر مالکِ اسلامیہ ایک مرکز سے وابستہ تھے۔ یہ واپسی جذباتی تھی۔ لیکن سیاست نے اسے کھوکھلا کر دیا تھا۔ عربوں کو ترکوں کے خلاف شکایات تھیں۔ ترک اندر وطنی اور بیرونی مصائب میں مبتلا تھے۔ اس پر مستزاد استعمار کا سیلا ب اور قویٰ مغرب کی باہمی رقبابت تھی۔ آتشِ فشاں پہاڑ بالآخر پھوٹا، اور 1914ء میں جنگِ عموی کے شعلے بھڑک اٹھے۔ ترکی جنگ میں جرمنی اور آسٹریلیا کا حلیف بنا۔ خلیفۃُ اُمَّۃِ الْمُسْلِمِینَ کی حیثیت سے سلطان ترکی نے جہاد کا اعلان کیا۔ اس اعلان کا اثر شام یا مالکِ عربیتک، ہی محدود نہ تھا بلکہ بر صغیر کے مسلمانوں تک بھی تھا۔ برطانیہ کے لئے یہ عظیم الشان خطرہ تھا جس کا سد باب اشد ضروری تھا۔ کچھ کی سیاسی پیش میں کو اس خطرہ کا احساس جنگ سے پہلے ہی ہو گیا تھا۔ چنانچہ فروری 1914ء میں وہ حسین ابن علی، شریف مکہ سے اس کے دوسرے بیٹے عبداللہ کی معرفت مل چکا تھا۔

### عرب اور برطانیہ:

عرب، خود متفرق اور غیر منظم تھے۔ حسین، شریفِ مکہ، اپنی خلافت کا خواب دیکھ رہا تھا۔ وہ ترکی کے خلاف انگریز سے سازش کرنا چاہتا تھا۔ لیکن عربوں پر اُسے یہ اعتماد نہیں تھا کہ وہ وحدت عربیہ پر جمع ہو جائیں گے۔ اس کا دوسرا بیٹا عبداللہ پر اُمید تھا۔ وہ والد کی طرف سے کچھ، ستارس اور بعد میں سرہنری میکیو ہن سے مصروف گفتگو رہا۔ حسین کا تیسرا بیٹا فیصل ترکی کی معاونت کو ترجیح دیتا تھا، تاکہ اس پر احسان کر کے معاہدہ امن میں کچھ حاصل کیا جائے۔ حسین نے عبداللہ سے اتفاق کیا۔ بقول لارنس، حسین، فیصل سے متفربھی تھا۔ چنانچہ حسین نے انگریزوں سے مذاکرات جاری رکھے۔ اس کے ساتھ اس نے الفسطار، الاحمد جیسی انقلابی جماعتوں سے بھی مراسم قائم کر لئے۔ کیونکہ وہ ترکوں کے خلاف کہیں زیادہ باغیانہ سرگرمی دکھار رہی

تحصیں۔ جنگ جاری رہی۔ موقع تھا کہ عالمِ عرب کو ترکوں سے علیحدہ کیا جائے اور اپنے زیرِ اثر کیا جائے تاکہ انہیں ترکوں کے خلاف صاف آرا کیا جاسکے۔ ایسے میں رسوئے عالم میکو ہن مرسلت کا آغاز ہوا۔ میکو ہن مصر میں بروگرانوی ہائی کمشٹر تھا۔ حسین کا مطالبہ عرب آزادی کے ساتھ یہ بھی تھا کہ عربی حکومت کی مغربی سرحد بحر قلزم اور بحر روم تک ہو۔ اس تحدید میں عرب، عراق، شرق اردن، فلسطین اور شام شامل تھے۔ میکو ہن نے اسے تسلیم کرتے ہوئے ان اضلاع کو نکال دیا جو دمشق، حمص، حماہ اور حلب کے مغرب میں واقع تھے۔ کیونکہ وہ علاقے غالباً عربی نہ تھے۔ اس ”مغرب“ کی بعد میں یہ تو جیہہ کی گئی کہ اس سے فلسطین عربی سلطنت کی حدود سے خارج ہو گیا تھا۔ خود میکو ہن نے ایک مرتبہ لندن ٹانکر میں لکھا کہ جن علاقوں سے متعلق وعدے کئے گئے تھے ان میں فلسطین شامل نہیں تھا۔ یہ قطعی غلط ہے اس لئے کہ میکو ہن نے عربی سلطنت کی حد بحر روم تک تسلیم کر لی تھی۔ اس سے فلسطین خود بخود عربی حکومت میں آ جاتا تھا۔ اگر بغرض استدلال اس شرط کو ساقط سمجھ لیا جائے تو نقشہ پر دیکھنے سے صاف معلوم ہو جاتا ہے کہ فلسطین دمشق کے مغرب میں نہیں بلکہ جنوب مغرب میں ہے ایسی دوراز کار اور احتمال نہ تو جیہیں بروگرانوی سیاست کا لازم ہیں۔ خود پاکستان کو ان کا کس قدر تیخ تجوہ ہو چکا ہے۔ فلسطین کو خارج کرنے کی ایک اور ایسی ہی لچر دلیل دی جاتی ہے۔ میکو ہن نے ایک شرط یہ لگائی تھی کہ عربوں کے مطالبات تسلیم کرنے میں بروگرانیہ فرانس کے مفاد کے منافی اقدام نہیں کرے گا۔ فلسطین میں فرانس کا مفاد کچھ بھی نہیں تھا۔ لہذا، یہ شرط فلسطین کے معاملہ میں ساقط اعمال ہو جاتی ہے۔ یوں بھی فلسطین عربی ملک تھا، اس کی عرب آبادی نوے فیصلی تھی۔ اس کے اخراج کا سوال ہی پیدا نہیں ہوتا تھا۔ فلسطین کو نکال کر عربی حکومت اور وحدتِ عربیہ کا مطالبہ بے معنی ہو جاتا تھا۔ ایک حلقة میں یہ بھی کہا جاستا ہے، کہ چونکہ انگریز نے فلسطین کو فتح کیا تھا اس لئے اسے حق حاصل تھا کہ وہ اس کا کچھ بھی ”استعمال“ کرتا۔ تو میں جائیدادیں نہیں ہوتیں کہ ان پر حق ملکیت تسلیم کیا جائے اور جیسے جی میں آئے ان کا استعمال کیا جائے۔ بیسویں صدی کی مہذب دنیا میں اس متروک و مردو نظریہ کو اساس گفتگو نہیں بنایا جا سکتا۔ یہ طرزِ استدلال غمازی کر رہا تھا کہ فرنگی ذہن سیاسی استبداد و ظلم سے اوپر نہیں اٹھ سکا۔ ایسے حضرات نے ابھی سینیا پر اٹلی کا حق ملکیت کبھی تسلیم نہیں کیا۔ نہ انہوں نے چین کے مفتوحہ علاقے میں جاپان کا حق تسلیم کیا۔ اٹلی اور جاپان کے خلاف ان کی دی ہوئی لیبلیں خود ان کی تردید اور تعلیط کے لئے کافی ہیں۔

کرمل لارنس نے جنگ کے دوران عربی جذبات وطنیت کو ابھارنے میں کارہائے نمایاں سرانجام دیئے۔ ایلن بی نے اکتوبر 1917ء میں جب فلسطین میں جارحانہ کارروائی شروع کی تو ایسا معلوم ہوتا تھا کہ انگریز ایک حلیف ملک میں لٹڑ رہے ہیں اور ترک دشمن ملک میں ہیں۔ عرب سپاہی ترک فوجوں سے بھاگ بھاگ کر آ رہے تھے۔ اور ترکی عساکر کا سلسہ رسد و سائل درہم برہم ہو رہا تھا۔ ایلن بی کے الفاظ میں عربی کی امداد ”بے بہا“ تھی۔ لائند چارچ نے موتمر امن (1919ء) میں اعتراف کیا:

”شاہ فیصل نے اپنے تمام ذرائع ہمارے سپرد کر دیئے جس سے ہم کو مادی طور پر سب سے زیادہ مدد اور فتوحات میں ملی۔“

جنگی امداد کے علاوہ عربوں نے انگریز کو کامیاب و فاتح بنانے کے لئے کیا کیا، اس کا اندازہ مندرجہ ذیل اقتباس سے لگائیے:

ان (عربوں) کے گھر کی ایک ایک چیز خوراک، خریدنے میں صرف ہو گئی۔ حتیٰ کہ ان کی چھتوں کی ٹالیں بھی بکنا شروع ہو گئی تھیں۔۔۔ (یہ حالت جولائی 1917ء کی ہے) پندرہ ماہ بعد جب بیروت فتح ہوا ہے تو حالات اور بگڑ چکے تھے۔ یہ کہنا شک و شبہ سے مبراہے کہ جنگ کے دوران تین لاکھ شامی فاقوں سے مر گئے۔ صحیح شمار ساڑھے تین لاکھ کا ہے۔ کوئی تین ہزار جیلوں میں جھونک دیئے گئے جن میں سے پیشتر نہ راجل ہو گئے۔ شام کی چالیس لاکھ آبادی میں سے پانچ لاکھ کے لگ بھگ جنگ میں کام آئی۔ (The Arab Awakening)

### عربی آزادی:

عرب مسلمان تھے۔ انہوں نے ترکی دعوتِ جہاد کی کیوں پروانہ کی؟ لارنس کے الفاظ میں: دورانِ جنگ میں عربوں کی ترکوں کے خلاف بغاوتِ اس لئے نہیں تھی کہ ترکوں کی حکومت خراب تھی، بلکہ اس لئے کہ عرب آزادی چاہتے تھے۔ انہوں نے جنگ کی آگ میں اپنی جانیں اس لئے نہیں جھوکنیں تھیں کہ وہ آقاوں کی تبدیلی کریں اور برطانوی رعایا بن جائیں یا فرانسیسی شہری، بلکہ وہ اپنا صحیح مقام حاصل کرنا چاہتے تھے۔ (لارنس کے خطوط)

ترکوں کے دور نے عربوں میں بڑی حد تک جذباتِ قومیت و آزادی پیدا کر دیئے تھے۔ انگریز نے اس کا فائدہ اٹھایا اور عربوں کو آزاد عربستان کا سبز باغ دکھایا۔ عربوں کا اس دام میں آجانا عہدِ ماضی کا قدرتی نتیجہ تھا۔ ترکی اور جرمی اتحاد کی شکست کی واحد صورت بھی تھی کہ مشرق و سلطی سے ان کو بے دخل کر دیا جاتا۔ اپنی اہمیت کے پیش نظر مشرق و سلطی جنگ کے نتیجہ کے لئے فیصلہ کرن حیثیت رکھتا تھا۔ انگریز نے یہیں اپنے قدم جمانے کی کوشش کی۔ انگریز کی وسیع سلطنت کے لیے مشرق و سلطی خصوصیت سے اہم تھا۔ چنانچہ عربوں کو ترکوں سے علیحدہ کرنے کے لئے انگریز نے کمال فراغدی سے ان سے وعدے کئے۔ چونکہ مقصد عربوں کو ترکوں کے خلاف صفت آراء کرنا تھا، اس لئے وعدوں کی معقولیت کو بالکل نظر انداز کر دیا گیا۔ اس سلسلہ میں انگریز نے ہر اس چیز کا وعدہ کیا جو وہ کر سکتا تھا اور جس کا نتیجہ عربوں کو ترکوں سے علیحدہ کرنا ہو سکتا تھا۔

عربوں کی شرکتِ جنگ وطنی آزادی کی خاطر تھی اور انگریز نے اس کا حتمی وعدہ کر رکھا تھا۔ لیکن وہ اپنے قول میں کس قدر مخلاص تھا، اس کا اندازہ اس وقت کے واقعات سے لگایا جاسکتا ہے۔ میکوہن نے اگست 1915ء میں حسین کو لکھا: لارڈ کچر نے جو اعلانِ علی آندی کی معرفت آپ تک پہنچایا ہے جس میں ہماری ممالک عربیہ اور ان کے باشندگان کی آزادی کی خواہش کا اظہار ہے، ہم اس کی تصدیق کرتے ہیں۔

### خفیہ معاہدہ:

مئی 1916ء میں جب عرب یقینی طور پر انگریزوں کے حلیف بن چکے تھے۔ برطانیہ اور فرانس میں ایک خفیہ معاہدہ (Sykes Picot Agreement) طے ہوا۔ اس معاہدہ میں ہر چند برطانیہ (اور فرانس) کے اس عزم کا اظہار کیا گیا کہ وہ ایک آزاد عرب حکومت یا مغربی وفاق کے موید ہیں، لیکن اس کے ساتھ ہی انہوں نے معاہد ممالک عربیہ کو حلقة ہائے اثر

(برطانوی اور فرانسیسی) میں تقسیم کرنے میں اتفاق کر لیا۔ اس معاہدہ کی رو سے فلسطین کو بین الاقوامی علاقہ قرار دے دیا گیا۔ ذرا غور کیجئے! معاہدہ عربی ممالک سے متعلق ہور ہا ہے اور عربوں سے انگریز کے حقیقی مowaعید موجود ہیں۔ لیکن اس کے باوجود فرانس سے یک طرفہ معاہدہ کر لیا جاتا ہے جو اس معاہدہ کی صریح خلاف ورزی ہے جو عربوں سے کیا جا پکھا تھا۔ اگر سائیکس، پکٹ معاہدہ برطانیہ کے سابقہ مowaعید کے مطابق تھا تو حسین سے پوشیدہ کیوں رکھا گیا؟ کیا یہی بات شک کے لئے کافی نہیں تھی؟ استعمار فرنگ کی یہ بداخلی اور بدولیتی بین الاقوامی سیاست کا طرہ امتیاز ہے اور بین الاقوامی مسائل کی کہان میں سے اہم فلسطین ہے علت اعلل ہے، روی حکومت نے اسی غفیہ معاہدہ کو شائع کر دیا۔ اور حسین نے فوراً میکو ہن کو اس کے متعلق لکھا تو میکو ہن نے اسے ترکی کی شرائیک کوشش قرار دیتے ہوئے عربوں کی یوں تشفی کی کہ برطانیہ پہلے کی طرح عزم مصمم کئے ہوئے ہے کہ وہ وحدت واستقلال عربیہ کی تشکیل و تقویم کرے گا۔ انگریز کی اس منافقت کا انشاف ہونے سے عربوں کے ایک حلقة میں نہ صرف انگریز سے متعلق بلکہ خود حسین کے متعلق شکوک پیدا ہو گئے۔ چنانچہ سات عرب زعماء نے برطانیہ کو ایک یادداشت بھیجی، جس کے جواب میں وزارت خارجہ (برطانیہ) نے (The Declaration to Seven) شائع کیا۔ اس اعلان میں پھر اعادہ کیا گیا۔

جن عربی ممالک پر اتحادی فوجوں نے قبضہ کیا ہے، ان کے متعلق ملک معظم کی حکومت کی پالیسی یہ ہے کہ ان ممالک کی آئندہ حکومت متعلقہ باشندوں کی رضامندی سے تشکیل پذیر ہو۔ جو علاقے ابھی تک ترکوں کے قبضہ میں ہیں، ان کے متعلق ملک معظم کی حکومت کی خواہش ہے کہ ان علاقوں کے غلام باشندے خود مختاری اور آزادی حاصل کریں۔ ملک معظم کی حکومت اس مقصد کی تکمیل میں بدستور کوشش رہے گی۔

7 نومبر 1917ء کو فلسطین، شام اور عراق کے کونے کونے میں ایک اعلان چسپاں کرایا گیا جس میں تحریر تھا: مشرق و سلطی میں جرمی نے جس جنگ کی طرح ڈالی ہے اس میں شریک ہوتے ہوئے برطانیہ اور فرانس کے پیش نظر مقصد ان لوگوں کی مکمل اور حقیقی آزادی (Complete and Final Liberation) ہے جو اب تک ترکوں کے غلام چلے آئے ہیں نیز ایسی قومی حکومتوں کی تشکیل جو مقامی باشندوں کے آزادانہ انتخاب و فیصلہ کا نتیجہ ہوں گی برطانیہ اور فرانس کسی قسم کا بھی نظام حکومت اپنی طرف سے مسلط نہیں کریں گے۔ بلکہ وہ ایسی مؤثر امدادیں گے جس سے وہ حکومتیں بخوبی چل سکیں۔

عربوں سے ایک مرتبہ نہیں، دو مرتبہ نہیں، بیسیوں مرتبہ وعدے ہوئے کہ ایک عرب ریاست یا عربی ریاستوں کا وفاق قائم کیا جائے گا۔ لیکن موتمر امن اور اس کے مابعد عربوں کو تقسیم اور تقسیم در تقسیم کے سوا کچھ نہ ملا۔ سیریا کوشام، لبنان، فلسطین، عراق اور شرق اردن میں تقسیم کر دیا گیا۔ بقیہ شام کو آزادی نہیں دی گئی بلکہ مجبور کیا گیا کہ وہ انتداب قبول کرے۔ انتداب ایک ”بدعت“ تھی جو جمعیت اقوام نے پیدا کی۔ نہ اس کا عربوں کی طرف سے مطالبہ ہو سکتا تھا، نہ انگریزوں کی طرف سے وعدہ۔ وعدہ غالباً آزادی کا تھا جسے پہلو بدل بدل کر تلا لگایا۔ عراق حسین کے بیٹے، فیصل کو بخش دیا گیا۔ شرق اردن اس کے بیٹے عبداللہ کو۔ شام، فرانس کے انتداب میں دے دیا گیا اور فلسطین برطانیہ کے انتداب میں۔ کیا یہ فیصلے ان وعدوں کے

مطابق تھے جو جنگ کے دوران عربوں سے کئے گئے تھے؟ کیا عربوں کا مطالبہ انتداب کا تھا؟ کیا یہ نئی حکومتیں مقامی باشندوں کی رضامندی سے منسلک ہوئی تھیں؟ عراق نے انتداب کی مخالفت کرتے ہوئے بامرِ مجبوری امریکی انتداب کو ترجیح دی، لیکن اسے انگریزوں کے حوالے کر دیا گیا۔ یوں مقامی باشندوں کے ان مطالبات و حسیات کو ٹھکرایا گیا جس کے احترام کے حقیقی اور کبر و عدے موجود تھے۔ لارنس لکھتا ہے:

فرانس نے دیوانہ وار انتداب بدلنے کی کوشش کی۔ برطانیہ نے شرمناک سودا کر کے اس (فرانس) کی تائید کی۔ تاکہ وہ میں سو پوٹھیا حاصل کر سکے۔ س۔پ۔ معاهدہ کی رو سے فرانس کو ساحل ملا اور عربوں کو حلب، حما، حمص، دمشق اور شرقی اردن۔ انتداب، کے صدقے میں اکثر ویژتھر حصے انگلستان اور فرانس نے ہٹھیا لئے۔ س۔پ۔ معاهدہ تحدید میں احتمال نہ تھا مگر اس میں شام کا حقیقتی مختاری تسلیم کیا گیا تھا۔ یہ (معاهدہ) آئندہ فیصلے سے دس ہزار گناہ بہتر تھا۔

#### اعلان بالفور:

برطانیہ کو پچونکہ جنگ میں عربوں کی امداد کی ضرورت تھی، اس نے اس نے ان سے رنگارنگ وعدے کئے۔ برطانیہ کو اسی طرح یہودیوں کی امداد کی بھی ضرورت تھی۔ چنانچہ اس نے عربوں کی طرح یہودیوں سے مبالغہ آمیز اور غیر دیانتدارانہ وعدے کئے۔ پہلی عالم گیر جنگ میں، کہ جس کے سیاسی پس منظر کے ایک پہلو کو ہم جائزہ لے رہے ہیں، جرمی کی لچائی ہوئی نظریں مشرق وسطیٰ پر تھیں۔ وہ یہودیوں کی امداد حاصل کرنے کے لئے موہوم وعدے کر سکتا تھا۔ انگریز نے جرمی کے وعدوں کو کھو کھلا کرنے کے لئے اس پر سبقت لے جانا چاہی۔ چنانچہ یہودیوں کو بھی عربوں کی طرح سبز باغ دکھائے گئے۔ ان متضاد وعدوں کی دوسری وجہ یہ تھی کہ امریکہ میں یہودیوں کا بے پناہ اثر تھا۔ وہ منحص امریکی پریس پر ہی چھائے ہوئے تھے بلکہ حکومت کی پالیسی ان کے ہاتھ میں تھی۔ برطانیہ، امریکہ کو اپنی طرف سے جنگ میں شریک کرنا چاہتا تھا۔ امریکہ کے بغیر جنگ کے لئے نہ مطلوبہ سرمایہ فراہم ہو سکتا تھا، نہ مطلوبہ بارود اور اسلحہ۔ امریکہ کو شریک جنگ کرنے کا ایک ذریعہ یہودی تھے۔ تیسرا وجہ ڈاکٹر اائز مین، صدر رہائشیں ایسوئی ایشن نے مہیا کی۔ کیمیا داں وائز مین نے کیمیائی جنگ کے سلسلہ میں کوئی اہم انسٹاف کیا جیسے اس نے برطانیہ کے سپرد کر دیا۔ برطانیہ اس احسان کا بدلہ ضرور دینا چاہتا تھا اور دائز مین نے ذاتی انعام سے انکار کر دیا تھا۔ ان سب الحجتوں کا حل اعلان بالفور ہے جو 2 نومبر 1917ء کو شائع ہوا۔ اس میں مرقوم تھا۔

ملک معظم کی حکومت فلسطین میں یہودی طین کے قیام کو بھتیر استحسان دیکھتی ہے اور امکانی کوشش کرے گی کہ اس کا حصول آسان ہو جائے۔ یہ واضح رہے کہ ایسا کوئی اقدام نہیں کیا جائے گا جس کی ز فلسطین میں موجودہ غیر یہودی فرقوں کے شہری اور مذہبی حقوق پر پرے یا یہودیوں کے اس سیاسی مرتبہ اور حقوق پر جو نہیں دیگر ممالک میں حاصل ہیں۔ اعلان بالفور ایک اہم سرکاری دستاویز ہے کہ جس کی رو سے یہودیوں اور عربوں کی تقدیر کا فیصلہ کیا گیا۔ لیکن اس عجیب و غریب دستاویز میں کہیں عربوں کا ذکر نہیں۔ فلسطین کی آبادی میں اختتم جنگ پر تو یہ فتنے فی صدی عرب تھے اور صرف دس فی صدی یہودی۔ لیکن اس بدقسمت ملک کے مستقبل کا فیصلہ کرتے وقت ذکر ہوتا ہے تو یہودیوں کا اور غیر یہودی فرقوں کا۔ گویا فلسطین میں بیشتر

یہودی آباد تھے اور عرب اقلیت تھے۔ ایسی اقلیت کہ اسے ”غیر یہودی“، فرقہ، کی غیر واضح اور بہم اصطلاح سے ہی یاد کیا جا سکتا تھا۔ اس سارے اعلان میں، عرب، کا لفظ تک نہیں۔ اور مدد برین و سیاستدان عربوں کی قسم کا فیصلہ چکار ہے تھے۔ فلسطین کے اولین باشندے کون تھے؟ یہ کوئی بھی وثوق سے نہیں کہہ سکتا۔ یہ یقین ہے کہ عرب (مسلمان) تیرہ سو سال سے اس ملک پر قابض و متمکن چلے آ رہے تھے۔ یہودی دو ہزار سال سے اس ملک سے بے دخل تھے۔ اور اس دو ہزار سال میں ان کی زیادہ سے زیادہ آبادی دس فی صدی ہو سکی تھی۔ کیا دو ہزار سالہ تاریخ کا نو شہر مٹا یا جا سکتا ہے؟ کیا اتنے طویل سفر سے رجعت ممکن ہے؟ کیا انگریز یا کوئی طاقت تاریخ کے فیصلے کوالت سکتی ہے؟ کیا یہودیوں کو فلسطین اس لئے دیا جا سکتا ہے کہ وہ کوئی دو ہزار سال پیشتر اس میں آباد تھے؟ اس کے بعد وہ بھیڑ بکریوں کی طرح وہاں سے بکھیر دیئے گئے اور پھر بھی اتنی قوت بھی مجتمع نہ کر سکے کہ اس مقصد ملک پر سلطان جاسکیں؟ کیا ب انگریزوں کو محض اس لئے جمنی کا ملک دیا جا سکتا ہے کہ ان کے آبا و اجداد کبھی جرمی میں آباد تھے؟ یا انگلستان جرمی کو بدیں وجہ بخشنا جا سکتا ہے کہ اسے کبھی جرم اسلام فتح کیا تھا؟

**یہودی وطن نہ کہ یہودی حکومت:**

بہر کیف اعلان بالغور نے ”قومی وطن“ کا وعدہ کیا، نہ کہ قومی حکومت کا۔ لیکن اس کے بعد کی ساری سیاست اسی نقطے کے گرد گھوم رہی ہے کہ فلسطین یا اس کے کسی حصے میں یہودی حکومت قائم ہو جائے۔ ”قومی وطن“ ایک بالکل فی اصطلاح تھی، لہذا دیانت کا تقاضا تھا کہ اس کے معانی متعین کروئے جاتے تاکہ فریقین غلط فہمی میں مبتلا نہ ہوتے۔ اس سے پہلے بھی یہ مضمکہ خیز تصور پیش نہیں ہوا تھا کہ کسی ایک قوم کو کسی اور قوم کے ملک میں قومی وطن دے دیا جائے۔ اس اصطلاح کو قصد اہم ہم رکھا گیا تاکہ جانشین کو اس حسین مغالطہ میں رکھا جائے کہ ان کے حقوق محفوظ ہو گئے ہیں۔ اس کے معانی یہودیوں نے کیا سمجھے؟ اس کا اندازہ دائز میں کے ایک اعلان سے ہوتا ہے جس میں اس نے کہا کہ اب فلسطین ایسی ہی یہودی مملکت بن جائے گی جیسی کہ انگلستان انگریزوں کی ہے۔ کہا جاتا ہے کہ بالغور نے زبانی اس مجبوب کی بڑی تائید بھی کی تھی۔ لیکن کیا آئیں وقایون میں زبانی وعدے کوئی حقیقت رکھتے ہیں؟ بالخصوص ایسے وعدے جنہیں ضبط تحریر میں لانے سے خاص طور پر گریز کیا جائے؟ وہ استغاثہ کی بنیاد نہیں بن سکتے نہ فیصلہ کی اساس ہو سکتے ہیں۔ کیا ایسے زبانی وعدے کسی ملک پر اس کی منشاء و رضا مندی کے خلاف مسلط کئے جاسکتے ہیں؟

**شاہ فیصل نے اعلان مذکورہ کو غیر مشروط تسلیم نہیں کیا بلکہ اس سے متعلق معاهدہ پر دخنخڑ کرتے ہوئے تحریر کیا:**  
بشریکہ عرب اپنی آزادی حاصل کر لیں۔۔۔ لیکن اگر معمولی کی بیشی بھی ہو گئی تو میں اس اعلان کے ایک لفظ کو بھی نہیں مانوں گا۔ اور یہ اعلان ساقط العمل، بیکار اور ناجائز ہو جائے گا۔ اور میں کسی طرح بھی کسی قسم کا جواب دہنیں رہوں گا۔

یہ غیر بہم تحریر ہے اور اس کے صرف ایک ہی معنی ہو سکتے ہیں۔ اعلان بالغور عربوں کی آزادی میں فتح ہو تو قبل عمل ورنہ بے کار، ناجائز، ساقط العمل! اس اعلان نے یقیناً عربوں کی آزادی نہیں دلائی بلکہ نہیں اور پابند سلاسل کر دیا۔۔۔ لہذا عرب اس کا ایک لفظ بھی ماننے پر مکلف نہیں۔۔۔ لہذا اعلان ساقط العمل! اب اسے اساس مذکرات بنانا یعنی چا!! اس کے بعد معاهدہ لوزان (1923ء) کی رو سے فلسطین کو برطانوی انتداب میں دے دیا گیا جس کی اساس اعلان بالغور پر استوار تھی۔ (جاری ہے)

بِسْمِ اللّٰهِ الرَّحْمٰنِ الرَّحِيْمِ

# علماء پرویز علامہ کی آخری اپیل

آخر میں، میں اپنی اُس مخلصانہ اپیل کو ایک بار پھر دھرا دیں گا، جسے میں ہر سال آپ کی خدمت میں پیش کرتا ہوں اور وہ یہ ہے کہ:

- 1- اپنے ذہن میں کسی غیر قرآنی تصور و خیال کو جاگزیں نہ ہونے دو۔
  - 2- اپنے قول سے ہی نہیں بلکہ اپنے عمل سے ثابت کرو کہ قرآن کی تعلیم انسان کو کس مقام پر لے جاتی ہے۔
  - 3- قرآنی فکری نشر و اشاعت کو اپنی زندگی کا مقصد قرار دو لیکن جو کچھ کرو خالصۃ لوجه اللہ کرو۔ اس میں کسی ذاتی مفاد یا جذب کو دخل انداز نہ ہونے دو۔
  - 4- آپ سے کسی قسم کی کوئی حرکت ایسی سرزد نہ ہونے پائے جس میں فرقہ پرستی یا پارٹی بازی کا شانہ تک بھی پایا جائے۔ اپنے دامن کو ان خاردار جھاڑیوں سے قطعاً ناجھٹنے دو۔
  - 5- اپنے وقت اور توانائی کو، ضدی طبقے کے ساتھ بحث و تھیص میں ضائع نہ کرو۔ قرآنی تعلیم کو صرف ان لوگوں کے سامنے پیش کرو جو علم و بصیرت سے سمجھنے اور سنجیدگی سے اس پر غور کرنے کے لئے تیار ہوں۔
  - 6- ہر رات سونے سے پہلے یہ سوچو کہ:
    - (1) دن بھر میں نے قرآنی احکام و تعلیم کے خلاف تو کوئی کام نہیں کیا۔
    - (2) آپ نے کسی دُکھی انسان کو سکھ پہنچانے کے لئے کیا کیا ہے۔ یاد رکھیے! انسانیت کی بے لوث خدمت بلند ترین مقصد زندگی ہے۔
- اور آپس میں پیار و محبت اور مودوت والفت کے ساتھ رہو کہ دنیا میں قرآنی رشتے سے زیادہ پاکیزہ اور گہرا رشتہ اور کوئی نہیں۔

اللّٰہ آپ کو خوش و خرم رکھے اور آپ کے عزائم کو کامیابی عطا فرمائے

(والسلام)

(منزل بہ منزل، ص: 181)

بِسْمِ اللّٰهِ الرَّحْمٰنِ الرَّحِيْمِ

## سپاسنامہ

# بخدمت قائد اعظم محمد علی جناح

(23 مارچ 1940ء)

مارچ 1940ء کے آل انڈیا مسلم لیگ کے تاریخی اجلاس میں طلوعِ اسلام نے بھر پور شرکت کی۔ اپریل 1940ء کے شمارہ میں اس اجلاس کی روئیداد میں طلوعِ اسلام کے اُس سوال کا ذکر بھی ملتا ہے جو اجلاس کے دوران لیگ کے پندال کے باہر نصب کیا گیا تھا۔ سوال کی تفاصیل بیان کرتے ہوئے مدیر طلوعِ اسلام لکھتے ہیں کہ ”سال سے ہمارا مقصد پغمبلوں کی اشاعت سے کہیں زیادہ کرم فرمایا۔ طلوعِ اسلام سے ذاتی طور پر متعارف ہونا تھا اور شکر ایزدی کہ اس باب میں ہم فائز المرام واپس لوٹے۔ ہمیں یہ دیکھ کر بے حد سرسرت ہوئی کہ ہندوستان سے دُور دراز اور غیر معروف گوشوں کے لوگ آئے اور کوئی ایسا نہ تھا جو طلوعِ اسلام سے پہلے ہی واقف نہ ہو۔ یہ سب اللہ تعالیٰ کے فضل و کرم کا صدقہ ہے کہ جو اس مردمومن کی دعاؤں کے طفیل ہمارے حال پر ارزائ ہوا جس کی یاد طلوعِ اسلام کا سرمایہ زندگی ہے۔ ہمارے لئے یہ امر باعث صدم سرست تھا کہ جو حضرات وہاں تشریف لائے۔ ان کا ادارہ سے محض ایک رسالہ کے خریدار کا ساتھی نہ تھا بلکہ وہ اپنے آپ کو ادارہ کا ایک جز سمجھتے تھے۔ ادارہ کے ساتھ ان کا رشتہ علمی کی بجائے یکسر قلبی تھا۔ سوال پر ویسے بھی ہماری توقعات سے بڑھ کر رونق رہی اور اس ہجوم میں ہمارے بعض احباب اگر ہمارا ہاتھ نہ بٹاتے تو ہمیں بڑی مشکل کا سامنا ہوتا۔ بعض کتابیں سوال پر اتنی جلد ختم ہو گئیں کہ ایک کثیر تعداد حضرات کو مایوس لوٹا پڑا۔“

یاد رہے کہ ادارہ طلوعِ اسلام کا دفتر ان دونوں دہلی میں تھا اور غلام احمد پرویز بھی دہلی، ہی میں مقیم تھے۔ آل انڈیا مسلم لیگ کے مذکورہ بالا اجلاس میں شرکت کے لئے نہ صرف یہ کہ ادارہ طلوعِ اسلام کا وفد دہلی سے لاہور آیا بلکہ اپنی والہانہ محبت اور عقیدت کے پیش نظر ادارہ نے اس تقریب میں قائد اعظم محمد علی جناح ”کی خدمت میں ایک سپاسنامہ بھی پیش کیا جوتا تھا کا حصہ بن چکا ہے۔ ذیل میں تجدید یادداشت کے لئے اُسے آج پھر سامنے لایا جا رہا ہے۔ (مدیر)

### بہ شرف نظر

شیر پیشہ بیبا کی حریت۔ ضیغم نیستان جرأۃ و بسالت۔ شاہین افلاک تدبیر و سیاست۔ پرواہ شمعِ اخوت و حیثیت۔ طرہ کلاہِ ملک و ملت۔ بطل جلیل ہندیاں۔ و قائد اعظم اسلامیان۔ محترم المقام جناب محمد علی جناح (مدظلہ العالی)

## حریت نواز!

ذرانتصور میں لایئے ایسے وقت کو کہ ایک وحشت انگیز ہولناک بیباں میں راہ گم کر دہ مسافروں کا ایک بکھرا ہوا قافلہ نشانِ منزل سے مایوس ہو کر ضعف عزیمت سے پاشکستہ بیٹھ چکا ہو۔ ایک درماندہ راہرو کی صدائے دردناک جو آوازِ حیل کا کام دے رہی تھی، فطرت کے اُل قوانین کے تحت خاموش ہو چکی ہو۔ شام کا بھیانک سننا۔ سرپر منڈلانے والی شب تیرہ و تارکی ہبہت انگیزیوں کا پیام جانکاہ دے رہا ہو۔ غاروں میں چھپے ہوئے درندوں کے پاؤں کی آہٹ موت کو قریب تر لاتی نظر آ رہی ہو۔ درختوں کی اوٹ میں بیٹھے ہوئے رہنزوں کی ریشہ دوانیاں دامن صحراء پر پھیلتے ہوئے اندر ہیرے کے ساتھ بڑھتی چلی آ رہی ہوں۔ وہ لوگ جن کی قیادت و سیادت پر بھروسہ تھا، برادران یوسف کی طرح اپنے قافلہ کی گرال بہامتابع دوسروں کے پاتھ تھج ڈالنے کی فکر میں ہوں۔ غرضیکہ ہلاکت یقینی اور تباہی اُل معلوم ہوتی ہو۔ افرادِ قافلہ میں سے جن کے دلوں میں اسِ الم انگیز کیفیت کا احساس ہوان کی نگاہیں رہ کر آسمان کی طرف اُٹھ رہی ہوں کہ دُور اُفتی اُمید سے ایک شاہسوار روائی دواں دمیدوں کی ایک دنیا اپنے ساتھ لئے ان سوختے سامانوں کی طرف بڑھتا چلا آئے۔ منتشر افراد کا روائی کو پھر سے ایک مرکز پر جمع ہونے کی دعوت دے اور اپنوں اور بیگانوں کی تیار کردہ ہلاکت و بربادی کی گھاٹیوں سے بچاتا ہوا انہیں کسی محفوظ مقام کی طرف لے جانے کی فکر کرے۔ اندازہ فرمائیے کہ جو قلمی کیفیت اس وقت ان راہ گم کر دہ مسافروں کی ہوگی، وہی حالت آج ملتِ اسلامیہ (ہندیہ) کی ہے۔ تحریکِ آزادی کے آغاز سے مسلمانوں کی عمومی حالت یہ تھی کہ یہ ریت کے ذردوں کی طرح بکھرے پڑے تھے کہ تیز ہوا کا جھونکا آتا اور انہیں ادھر سے ادھر اڑا لے جاتا۔ پانی کی روآتی اور انہیں اپنے ساتھ بہا لے جاتی۔ اس کاروائی پس سالارکی متاع گرال بہا کو لوٹنے کے لئے چاروں طرف سے قوتیں جhom کر کے آ رہی تھیں۔ غیر توغیر، خود اپنوں کی یہ حالت تھی کہ ان کی سحر طراز یاں اور فسون ساز یاں ملت بیضا کو خداۓ طور سینا سے ہٹا کر گوسالہ پرستی کی دعوت دیتی تھیں غرضیکہ حالت یہ تھی کہ۔

نشانِ راہ دکھاتے تھے جو ستاروں کو ترس گئے تھے کسی مردِ راہِ داں کے لئے قوم کی صحیح راہنمائی کرنے والے ایک ایک کر کے چل بسے تھے۔ بزمِ ملت کی آخری شمع جس کی ضیاء پاشیوں سے لاکھوں آنکھیں پُر نور تھیں۔ 21 اپریل 1938ء کی صحیح کو بچکی تھی۔ اس کس مپرسی اور بیکسی کے عالم میں اللہ تعالیٰ نے اس منتشر قافلہ کی شیرازہ بندی کے لئے آپ کی ذاتِ گرامی کو چون لیا اور آپ کی نگاہِ دُورس نے اس قافلے کو بتایا کہ ان کے گردوپیش کس کس قسم کی خطرناک گھاٹیاں موجود ہیں۔ وہ گھاٹیاں جن میں کہیں ”متحده قومیت“ کے دام ہمنگ زمین میں کبوترِ حرم کو بچانے کی تجویزیں ہو رہی تھیں۔ کہیں کسی منبر سے یہ آواز آ رہی تھی کہ ”تمیتیں مذہب سے نہیں، اوطان سے نہیں ہیں اور یوں اس طائر لہ ہوتی کے بال و پر کو غبار آلودہ ارض و بوم بنائیں“ رسول ﷺ کافہ لناس کو جغرافیائی حدود کی آب و گل میں محبوس کیا جا رہا تھا۔ کہیں ”وَأَمْرُهُمْ شُوَرْيَ بَيْنَهُمْ“ (42:38) کی حامل قوم کی نگاہوں میں مخلوط انتخابات کے سراب کو آبِ حیوال بنائیں دھایا جا رہا تھا۔ کہیں اس ”أُولَى الْأَمْرِ مِنْكُمْ“ (4:59) مامور جماعت کے لئے غیر مسلموں کی امامت و قیادت کو عین دین قرار دیا جا رہا تھا۔ کہیں انگریز کے خلاف ”متحده مجاہد“ کے طسم سے کفار و مشرکین سے توںی کے جواز کے فتاویٰ شائع ہو رہے تھے۔

ایک طرف ایک مغزی آتش نفس سر دگاہ وار دھا کی مستعار لے میں یہ خواب آور گیت گارہاتھا کہ عالم گیر سچائیاں تمام مذاہب میں یکساں طور پر موجود ہیں اس لئے اسلام کو کسی دوسرے مذہب پر کوئی فویت نہیں۔ دوسری طرف کچھ خداوند مكتب شاہین بچوں کے لئے، اہمسا کی بازو شکن تعلیم کی اسکیمیں تیار کر رہے تھے۔ ہندو اپنے ذہن میں ”رام راج“ کے قیام کے منصوبے باندھ رہا تھا اور اس کے لئے انگریز سے ”شریفانہ معاهدے“ Gentleman Agreement استوار کر رہا تھا۔ ہندوؤں کے شور و غوغاء سے متاثرا انگریز بھی مسلمانوں کو بلا تامل ہندو کے ہاتھ میں دے دینے پر آمادہ تھا کہ وہ اپنی پانچ ہزار سالہ غلامی کا جذبہ انتقام اس کے خون سے ٹھنڈا کرے۔ جو لوگ اغیار کی صفوں میں کھڑے ہو کر ملت اسلامیہ کی نمائندگی کے دعویٰ کر رہے تھے ان میں اتنا سخنکی بھی استطاعت نہ تھی کہ بساط سیاست پر یہ آئینی مہرے کس طرح چلائے جا رہے ہیں۔ ہندو خوش تھا کہ میں نے 9 کروڑ فرزندان تو حید کواچھوتوں کی صفائی ملادیا۔ انگریز راضی تھا کہ وہ خجراں ہلال، جس کے بے نیام ہونے کے خوف سے کلیچہ محلیب میں ہمیشہ دھڑکن رہتی تھی، اسے گنگا کی لہروں میں بہادیا گیا کہ اس کس مدرسی کے عالم اور اس خلفشار و تشتت کے وقت آپ آگے بڑھے اور ہندوؤں اور انگریزوں کے ہر خفیہ منصوبے اور ہر پوشیدہ سازش کو ایک ایک کر کے بے نقاب کر دیا اور یوں ان کے تصورات کی حسین دنیا کو ایک خواب پریشان میں تبدیل کر کے رکھ دیا اور ساری دنیا پر اس حقیقت عظمی کو واضح کر دیا کہ۔

آسمان نہیں مٹانا نام و نشان ہمارا

بطل جلیل القدر!

ہمیں خوب احساس ہے کہ آپ کی منزل کس قدر کٹھن اور راستہ میں کس قدر مشکلات کا سامنا ہے۔ جہاں تک غیروں کا تعلق ہے مسلمان جیسی منتشر قوم کے مقابلہ میں ہندوستان اور برطانیہ کی دو بڑی قوتوں کا متحدہ محاذ ہی کچھ کم سنگ گراں نہیں لیکن غیروں سے کہیں زیادہ مہیب اور جان گداز مشکلات خوداپنوں کی پیدا کر رہے ہیں۔ ان ”اپنوں“ کو بھی چھوڑ یئے جو محض اپنی سنبھری اور روپیلی مصلحت کو شیوں کی خاطر نشتر گاہ وار دھا (Radio Station) کے آلات مکبر الصوت (Loud Speakers) بنے ہوئے ہیں۔ وہ تو اس مخالفت پر مجبور ہیں۔ لیکن سب سے زیادہ ماتم تو ان ”مخلص منافقین“ کا ہے جن کی رفاقت و حمایت بیش از یہ نیست کہ۔

کافر توانی شد، ناچار مسلمان شو

جن کا مقصد وحید اپنے طرہ وجہت کا قیام و بقا ہے۔ خواہ یہ آستانہ خواجہ یثرب سے واپسی ظاہر کرنے سے حاصل ہو جائے یا لشکرِ بولی میں شمولیت سے۔ بایں ہمہ نہ ان غیروں کا جو مخالفت ایسا ہے کہ اس سے کچھ خوف کھایا جائے اور نہ اپنوں میں سے بعض کی نواز شہائے بیجا اور دوسروں کے طعنہ ہائے دخراش ایسے کہ ان کا غم کھایا جائے۔ کہ جو حق پر ہوا سے کسی مخالفت کی کیا پرواہ ہو سکتی ہے۔

رہے ہیں اور ہیں فرعون تیری گھات میں اب تک مگر کیا غم کہ تیری آستین میں ہے یہ یہ بیضا

## حریت مآب!

ہمیں اس بات کا بھی علم ہے کہ مسلمانوں کی موجود تگ و دو ہیات میں جو نصب العین آپ کے سامنے ہے وہ وہی ہے جو ہر مسلمان کی نگاہوں کے سامنے ہونا چاہئے۔ جس کے دل میں بہ حیثیت مسلمان زندہ رہنے کی تڑپ اور اپنی نسلوں کو بہ حیثیت مسلمان رکھنے کی آرزو موجود ہے اور کسے معلوم نہیں کہ وہ نصب العین ہندوستان کے اندر ایک اسلامی ہند (Muslim India) کی تشکیل کے سوا اور کچھ نہیں۔ جس طرح آپ احوال و ظروف کا صحیح جائزہ لیتے ہوئے قدم بقدم اس درخشنده نصب العین کی طرف بڑھتے جا رہے ہیں وہ آپ کی بلند نگاہی اور حسنِ تدبیر کا آئینہ دار ہے۔ سطح میں لوگوں نے آپ کو صرف ایک فاضل مقنن اور دیدہ و مردبر کی حیثیت سے ہی پہچانا لیکن جن لوگوں کو آپ کے قریب ہونے کی سعادت نصیب ہوئی ہے وہ خوب جانتے ہیں کہ مبدأ فیض نے آپ کو اس قدر ذہن رسا کے ساتھ کس قدر دل پر سوز و پر درد کی نعمتوں سے نوازا ہے۔

خرد نے تجھ کو عطا کی نظر حکیمانہ سکھائی عشق نے تجھ کو حدیثِ رذدانہ  
اور قلب و نظر اور عقل و عشق کا یہی امتزاج ہے جو ایک ناخدا کے ششیٰ ملت کی متاع گراں بہا ہے۔  
نگہ بلند، سخنِ دل نواز، جاں پر سوز یہی ہے رخت سفر میر کاروائیں کے لئے  
عاليٰ مرتبت!

آپ یقین فرمائیے کہ جس قوم کی فلاح و بہود آپ کی زندگی کا منتہی ہے۔ اُس قوم کا سوادِ عظیم آپ کی قیادت و امارت پر کامل بھروسہ رکھتا ہے اور ان کی خاطر آپ نے جو گرامیِ قدر قربانیاں کی ہیں، ان کے دل میں ان کا پورا پورا احساس ہے۔ اس میں شبہ نہیں کہ وہ سرزمین پنجاب جو ملکِ اسلامیہ کے اس اجتماعِ عظیم کی تقریب پر آپ کی تشریف آوری سے سرفراز ہونے والی ہے اس میں آئینی نقطہ نگاہ سے Constitutionally ابھی پرانش لیگ کا قیام بھی عمل میں نہیں آسکا، لیکن ہمیں امید ہے کہ یہ حقیقت آپ کی نگاہ سے مستور نہ ہوگی کہ پنجاب کا ایک قریب اور اس قریب کے ایک ایک فرد کا دل آپ کی عظمت و عقیدت کا نشمن بننا ہوا ہے۔ بس کسی ایک مردِ خود آگاہ و خدا دوست کے نعرہِ متنانہ کی دیر ہے، یہ طوفانِ بلا انگیز کسی سے روکے نہیں رکے گا۔ اس وقت بچے گاؤ ہی جو ششیٰ ملت میں اخلاص و دیانت سے سوار ہو گا۔ اور پکارنے والا پکارے گا کہ:

لَا عَاصِمَ الْيَوْمَ مِنْ أَمْرِ اللَّهِ إِلَّا مَنْ رَّحِمَ (11:43)

سیداقوم! ادارہ طلوع اسلام، جسے ہزار ہا پر خلوص اور صحیح انظر مسلمانوں کی ترجیحی کا فخر حاصل ہے، اجلاسِ لیگ کی صدارت پر آپ کی خدمت میں ہدیہ تبریک و تہنیت پیش کرتا ہے اور مستعدی ہے کہ جس نصب العین کی طرف آپ کا قدم اٹھ رہا ہے، قوم کو اس کی طرف اور تیز گامی سے بڑھاتے جائیے۔ اس نصب العین کے اصول کے لئے اگر ضرورت پیش آئی تو آپ دیکھیں گے کہ قوم کس طرح کفن بردوش و سر بکف آپ کی دعوت پر لبیک کہتی ہے۔

بانشہ درساز و دماد زن چوں پختہ شوی خودرا بر سلطنت جم زن  
ارکین ادارہ طلوع اسلام، دہلی

- وہ دائرہ اسلام سے باہر پوٹی کے حکماء اور فضلاً کوڈھن میں رکھیں کیونکہ یہی لوگ ہیں جن کے قائل ہونے سے دنیا کی ذہنی فضائے باہل تصورات کا اثر زائل کیا جاسکتا ہے۔
- علیٰ دنیا کے مسلمہ خاقان سے آغاز کر کے ان قرآنی خاقانی کی طرف آئیں جن کی صحت لوگوں کے نزد یک مسلم نہیں۔
- کسی غلط عقیدہ کی محض نفی خلافین کو قائل نہیں کر سکتی جب تک اس کے مقابل کے صحیح تصور کا اثبات نہ کیا جائے۔
- وہ ایک فلسفہ یا ایک فلسفیانہ خیال کی تردید کے لئے جن تصورات کو صحیح سمجھ کر کام میں لا ایں تو کسی دوسرے فلسفہ یا فلسفیانہ خیال کی تردید کرتے ہوئے اسے غلط قرار نہ دیں۔ بلکہ اپنے موقف پر قائم رہیں۔

- مغرب کے صحیح تصورات کو نہ تور د کریں اور نہ ہی ان کے غلط تصورات کو قبول کریں۔

- ہر غلط فلسفہ کے اندر وہ جن تصورات کو صحیح سمجھیں انہیں دوسرے فلسفوں کی تردید کرتے ہوئے غلط قرار نہ دیں اور جن تصورات کو غلط سمجھیں، انہیں دوسرے فلسفوں کی تردید کرتے ہوئے صحیح قرار نہ دیں ورنہ وہ اپنی تردید خود کریں گے۔

### (3) ڈاکٹر بہان احمد فاروقی کا موقف:

- کسی علمی صداقت کے ساتھ متصادم نہ ہو بلکہ ہر زمانہ میں تمام علمی صداقتوں کے ساتھ پوری طرح سے ہم نوا اور ہم آہنگ رہے اور جوں جوں علمی صداقتیں مکشف ہوں وہ اس کے اندر سماقی چلی جائیں۔

- جس کے تمام تصورات ایک دوسرے کے ساتھ عقلی ربط و ضبط رکھتے ہوں اور ایک دوسرے کی عقلی تائید اور تو یقین کرتے ہوں۔ یہ اسی صورت میں ممکن ہو سکتا ہے جب اس کے تمام تصورات قرآن کے بنیادی تصور کے ساتھ عقلی طور پر متعلق ہوں۔

- جو تمام باطل فلسفوں کی موثر تردید کرتی ہو۔

- جو کائنات کا ایک کامل فلسفہ ہو اور حقیقت انسان و کائنات کے اہم مسائل کے بارے میں عملی راہ نمائی کرتی اور صداقت اور سچائی کا راستہ بتاتی ہو۔

- جو علمی تصورات کی خامیوں کو آشکار کر کے انہیں پاکیزہ اور رخصستہ بناتی ہو۔

- جو ہمیں احکام دین کی حکمتوں اور علتوں کے پورے سلسلہ سے آگاہ کرتی ہو اور ان حکمتوں اور علتوں کا ایک ایسا تصور دیتی ہو جس میں اندر وہی طور پر کوئی تضاد نہ ہو۔

❖❖❖

(اشاعت کے لئے محترم ڈاکٹر انعام الحق نے تعاون کیا ہے۔)

❖❖❖

PUBLISHED SINCE 1938 AT THE BEHEST OF ALLAMA IQBAL<sup>R</sup> AND QUAID-E-AZAM<sup>R</sup>

CPL.NO. 28  
VOL.77  
ISSUE  
3

Monthly **TOLU-E-ISLAM**

25-B, Gulberg 2, Lahore, Pakistan

Phone. 042-35714546, 042-35753666

E-mail:idarati@gmail.com Web: www.toluislam.org

www.facebook.com/idaratolueislam1/ www.youtube.com/idaratolueislam

1940

محلہ



یومِ پاکستان  
**RESOLUTION DAY**